اُردُو ڈراما نگاری کے ارتقا میں بہار کا حصہ
ڈاکٹر محمد قاسم

اردو ڈرامہ نگاری کے ارتقاء

میں

بہار کا حصہ

ڈاکٹر محمد قاسم

والد محترم مرحوم و مغفور (محمد مقبول حسین) کے نام

اور

والدہ محترمہ مرحومہ و مغفورہ (جمیلہ خاتون) کے نام

یہ کتاب بہار اردو اکیڈمی پٹنہ کے
مالی تعاون سے شائع ہوئی!

Thesis approved for the degree of Doctor of Philosophy in Urdu of the Tilka Manjhi Bhagalpur University.

______ ڈاکٹر محمد قاسم
ناشر ______ گلستان ادب، پبلی کیشنز حسن آباد چمپانگر
______ بھاگلپور بہار۔
اشاعت ______ اوّل اگست ۱۹۹۷
تعداد ______ ۱۰۰۰ ہزار
صفحات ______
سرورق ______
مطبع ______
کاتب ______ عبدالرحیم (راہی گڈاوی)

تقسیم کار

۱ ادارہ گلستان ادب، حسن آباد پوسٹ چمپانگر بھاگلپور بہار
۲ نیو کتاب منزل۔ تاتارپور۔ بھاگلپور۔
۳ بہار اردو اکیڈمی۔ اردو گھر پٹنہ۔
۴ بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ ۸۰۰۰۰۴۔
۵ انجمن ترقی اردو بہار۔ اردو گھر پٹنہ۔
۶ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی۔
۷ ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ۔
۸ دفتر ماہنامہ دستک، ڈاکٹر حسین بخش لین میر غیاث چک
چمپانگر بھاگلپور بہار۔

اردو ڈراما نگاری کے ارتقاء میں بہار کا حصّہ
کا
مختصر جائزہ

.... ابراہیم یوسف

اردو میں ڈرامے کی کمی کا رونا برابر رویا جاتا رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو والوں نے ڈرامے کو کبھی قابل اعتنا صنف نہیں سمجھا بلکہ محض تفریح اور وقت گذاری کا ذریعہ سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے۔ ابتداء میں معتبر ادیب اور شاعر اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور یہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں پروان چڑھتا رہا جس کی کوئی خاص ادبی حیثیت نہیں تھی۔ جو پارسیوں کے اردو تھیٹر کے تنخواہ دار ملازم تھے اور ان کی تجارتی اغراض پوری کرنے پر مجبور تھے اور وہی کچھ لکھتے تھے جو ان کے آقا انھیں حکم دیتے تھے۔ اسلئے انکے لکھے ہوئے ڈرامے اسٹیج کیلئے تو کامیاب ڈرامے تھے۔ مگر انکی ادبی حیثیت کچھ زیادہ نہ تھی انکی ادبی حیثیت کو دیکھ کر آج کے ثقہ ناقد ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور ڈرامے جیسے طاقتور میڈیا کو نظر انداز کرتے ہیں یہ بھی ایک ستم ظریفی ہے کہ جب ڈرامے کا ذکر کیا جاتا ہے تو خیال یا تو پارسی تھیٹر کی طرف جاتا ہے یا پھر اندر سبھاؤں کی طرف دوسرے علاقوں میں ڈرامے پر جو کام ہوا ہے اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے ڈاکٹر محمد قاسم نے شمال کی اندر سبھاؤں اور بمبئی کے پارسی اردو تھیٹر سے قطع نظر کر کے صرف بہار میں جو اردو کی ڈرامے

لکھے گئے ہیں ان کا جائزہ لیا ہے جو ایک مستحسن اقدام ہے
بہار میں ڈرامے کی تنقید اور تحقیق پر جو کام ہوا ہے اگر
اسے بھی شامل کر لیا جاتا تو یہ کتاب بہار میں اردو ڈراما
نگاری کے تحقیقی و تنقیدی سرمائے کا سنگ میل ہوتی اور اس
کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جس طرح ڈاکٹر محمد قاسم
نے ایک علاقہ پر کام کیا ہے اگر ہر علاقے پر ایسا ہی کام ہو
تو اردو میں ڈرامے کی کمی کا جو رونا رویا جاتا ہے اسکی خاطر
خواہ تلافی ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد قاسم بہار میں اردو ڈرامے کا آغاز سنہ ۱۸۷۳ء
میں کیشو رام بھٹ کے ڈرامے "سجاد سنبل" سے قرار دیتے ہیں
گویا "اندر سبھا" امانت کی تصنیف کے تقریباً ۲۵-۲۶ سال
بعد ہوا۔ انہیں کا دوسرا ڈراما شمشاد سوسن سنہ ۱۸۷۶ء
میں لکھا گیا۔ یہ دونوں ڈرامے ہندی رسم الخط میں دستیاب
ہیں۔ پروفیسر سید حسن صاحب نے بھی ان کی نشاندہی کی
ہے۔ ان دونوں کا اردو رسم الخط میں منتقل کیا
جانا ضروری ہے۔ ڈاکٹر محمد قاسم نہ صرف کیشو رام بھٹ
بلکہ مولوی سید محمد خواجہ حسن علی، ہری ہر پرشاد بی یمانی، اختر
اورینوی، طارق جمیلی، سمیع الحق، شین مظفر پوری، سہیل
عظیم آبادی، قمر التوحید، تمنا مظفر پوری، شفیع مشہدی
صاحبان کے اسٹیج اور ریڈیائی دریافت ڈراموں کا فرداً فرداً
تفصیلی جائزہ لیکر ان کے مقام کا تعین کیا ہے۔ جس سے
اردو ڈراما نگاری کے ارتقاء میں بہار کا حصہ
کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے
ہمیں کچھ نئی باتوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ جناب

سمیع الحق نے یونانی ڈراموں "انٹی گونی"، شاہ ایڈیپس اور ایڈیپس ارض کولونو میں، منظوم تراجم کئے ہیں۔ جبکہ ان تینوں کے صرف نثری تراجم کا ہی علم تھا۔ یا یہ کہ سید محمد صاحب کا ڈراما "جوان بخت شمس النہار"، مثنوی زہر عشق سے ملخوذ ہے۔ اور منظوم ہے۔ زہر عشق کو بنیاد بنا کر احسن لکھنوی نے بھی ڈراما لکھا تھا اور جو لکھنؤ میں کھیلا بھی گیا تھا مگر دستیاب نہیں۔ طارق جمیلی کے ڈرامے "آگ اور پانی"، کو ڈاکٹر محمد قاسم علامتی ڈراما قرار دیتے ہیں۔ علامتی ڈرامے لکھنے کا رجحان اردو میں بالکل نیا ہے اور اردو میں مشکل ہی سے چند علامتی ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ اسطرح یہ ڈراما ان چند ڈراموں میں ایک اور اضافہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمد قاسم کی اس کتاب کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہار میں منظوم ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں اور نثری ڈرامے بھی اور یہ کہ بہار کے ڈراما نگاروں کا عام رجحان مسائلی ڈراموں کی طرف رہا ہے۔ اور انھوں نے آرائشی موضوعات سے گریز کیا ہے۔ ان کے موضوعات عام انسان کی روزانہ زندگی اور اسکے مسائل ہیں۔ ان کے علاوہ بین الاقوامی مسائل پر بھی ڈرامے لکھے گئے ہیں جیسے اختر اورینوی کے ڈرامے شہنشاہ حبشہ اور زوال کینٹین، وغیرہ۔ ڈاکٹر محمد قاسم کی کتاب بے حد معلوماتی ہے جس سے بہار میں ڈراما نگاری کی واضح شکل سامنے آجاتی ہے۔

ایک بات ضروری عرض کرنا ہے کہ ڈاکٹر محمد قاسم نے اردو کے ابتدائی منظوم ڈراموں کو بنظر کم دیکھا ہے اردو کے ابتدائی منظوم ڈرامے "و میرے یار لوگ"، ناٹک

یا پھر اندر سبھائیں ان کی نہ صرف تاریخی اہمیت مسلم ہے بلکہ انھوں نے اردو ڈرامے کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے ان کی اہمیت کو کسی صورت میں بنظر کم نہیں دیکھا جا سکتا اور نہ نثری ڈراموں کے مقابلہ میں کم تر درجہ دیا جا سکتا ہے۔

بہرحال ڈاکٹر محمد قاسم نے بہار کی ڈرامانگاری کی تاریخ ترتیب کر کے بڑا کام کیا ہے۔ جو آنے والے مورخ کیلئے بے حد مفید ہوگا اور وہ اس سے استفادہ کر سکے گا۔ یہ کتاب دوسرے علاقوں والوں کیلئے اپنے علاقوں کے ڈراموں کے جائزہ لینے کی رہنمائی کرے گی۔ اس کام پر ڈاکٹر محمد قاسم کو مبارکباد نہ دینا بخل ہوگا۔

نیم روڈ
امامی گیٹ
بھوپال ۴۶۲۰۰۱

مخلص
[illegible]

ڈاکٹر عبدالمغنی

وائس چانسلر متھیلہ یونیورسیٹی دربھنگا بہار،

ڈاکٹر محمد سید قاسم نے محنت وکاوش سے یہ تحقیقی مقالہ ایک سلیقے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں اکثر ماخذ کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے اور حاصل شدہ مواد کا جائزہ وتجزیہ دونوں پیش کیا ہے۔

اردو میں ڈرامانگاری کی روایت زیادہ وسیع وقدیم اور ترقی یافتہ نہیں ہے اگرچہ عصر حاضر میں ڈرامے کا پیش رو یا تمثیل کا اسٹیج، تھیٹر، ہندوستان کو اردو کی دین ہے۔ یہ بیش تر آغا حشر کے اردو ڈراموں پر مشتمل ہے جنہوں نے موجودہ فلموں کو فروغ دیا اور سینما کے آرٹ کی ترقی انھی کی بنیاد پر ہوئی۔ مکالمے اور نغمے، جو ڈرامے کے عناصر ترکیبی ہیں۔ ملک کو آغا حشر کے ڈراموں سے ملے ہیں۔

ڈرامانگاری کے اس ارتقا میں بہار کا حصہ بہت زیادہ نہیں تو شاید دیگر علاقوں سے کم بھی نہیں۔ تمثیل کی روایت جس طرح لکھنؤ، دلّی اور لاہور میں پروان چڑھی اسی طرح عظیم آباد میں بھی، خواہ پیمانے اور حجم کا فرق کچھ نہ کچھ ہو۔

عبدالمغنی

۱۷ فروری ۹۲ء

ڈاکٹر وہاب اشرفی
(چیئرمین)
بہار یونیورسٹی سروس کمیشن
پٹنہ

بہار میں اُردو ڈراما نگاری کے فروغ و ارتقا پر بہت کم تحقیقی کام ہوا ہے۔ اس سلسلے میں کسی کی طرف سے بھی پیش رفت ہوتی ہے تو وہ قابلِ تحسین ہے۔ ڈاکٹر محمد قاسم نے اپنی حد تک کوشش کی ہے کہ بہار میں ڈراما نگاری کی سمت و رفتار کا احاطہ کر لیں۔ یہ کام مشکل ضرور ہے پھر بھی اپنی رسائی کی حد تک ان کی کاوش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس موضوع پر مزید تحقیق و تنقید کا سلسلہ جاری رکھیں گے اور گمنام اور نامعلوم گوشوں کو روشن کریں گے

پروفیسر ڈاکٹر لطف الرحمٰن

یونیورسٹی پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو۔ ٹی۔ ایم، بھاگلپور یونیورسٹی بھاگل پور۔
ایم۔ ایل۔ اے، بہار اسمبلی۔ پٹنہ۔

"اُردو ڈراما نگاری کے ارتقاء میں بہار کا حصّہ"، یہ ڈاکٹر محمّد قاسم ریڈر و صدر شعبۂ اُردو بھاگلپور نیشنل کالج کی ایک تحقیقی کاوش ہے۔ بھاگلپور یونیورسٹی نے ڈاکٹر محمّد قاسم کو ان کے اس تحقیقی مقالے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔ ڈاکٹر سیّد مظفّر اقبال اس تحقیقی کاوش کے نگراں رہے ہیں۔ جو فی نفسہٖ اس امر کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب معیار و وقار رکھتی ہے۔

میری رائے میں یہ کتاب طالب علموں کے لئے بطورِ خاص ایک اہم تحفہ ہے۔ ڈاکٹر محمّد قاسم نے سخت محنت و خلوص اور تندہی کے ساتھ اس اہم موضوع کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔ اور حتی الامکان تمام ضروری معلومات سے استفادے کئے ہیں۔ بعد ازاں ان کی رائے اور بہار کے تعلق سے اُردو ڈراما کے ارتقاء کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ادبی دنیا کے لئے بھی میں اسے ایک اہم سرمایہ سمجھتا ہوں اور آپ کو خلوص کے ساتھ اس کے مطالعے کی دعوت دیتا ہوں۔

لطف الرحمٰن
۱۶ نومبر ۹۷ء

Scanned with CamScanner

پیش لفظ

یوں تو ڈراما نگاری ایک قدیم فن ہے اور ادب کی تمام صنفوں میں ڈراما کو غیر معمولی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے باوجود اردو ڈراما نگاری کی کم مائیگی کا ذکر اکثر و بیشتر کیا جاتا رہا ہے۔ جو بے جا ہے۔ دراصل اردو محققین و ناقدین نے اسکی طرف توجہ ہی نہیں دی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ڈراما نگاری کی تاریخ مرتب کرنے کی ناکام کوشش تو ضرور کی گئی ہے اور اب تک اس کی مفصل اور مستند تاریخ نہیں لکھی گئی ہے۔ اس میں بھی بہار کے ڈراما نگاروں کو تو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔

میتھو آرنلڈ کے مطابق:۔

"تنقید اس بات کی بے غرض کوشش ہے کہ دنیا کی بہترین معلومات و افکار سے آگاہی حاصل ہو۔ اور ان کی اشاعت کی جائے تاکہ ہماری تخیلی اور تخلیقی صلاحیت کو سہارا مل سکے۔"

کلیم الدین احمد نے تنقیدی و تحقیقی کتابوں پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ہے:۔

"اگر کسی کتاب سے زبان کے مسئلے پر روشنی پڑتی ہے۔ اگر وہ ادبی خوبیاں رکھتی تو اس صورت میں اُسے منظرِ عام پر لانا مفید ہے ورنہ غیر مفید"

میں نے میتھو آرنلڈ اور کلیم الدین احمد کے خیالات کے تحت اس کتاب کو پیش کیا ہے۔ لہٰذا موجودہ کتاب بہار کے ڈراما نگاری کی مکمل تاریخ تو نہیں تاہم اس کے ذریعہ اردو ڈراما نگاری کی مستند تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور میں نے پہلی دفعہ بہار کے ڈراموں اور ڈراما نگاروں پر تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ جس سے بہار کے ڈراما نگاروں کی قدر و قیمت کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعہ فن ڈراما نگاری اور اس کی تاریخ کو واضح کرنے کیلئے اس کتاب کو پانچ (۵) حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور الگ الگ عنوانات کے تحت اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس سے فن ڈراما نگاری اور بہار کے ڈراما نگاری کی واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ چنانچہ

پہلا باب:- ڈراما نگاری کا فن۔ مختصر تعارف ہے۔

اس میں فن ڈراما نگاری کے تمام اجزا ترکیبی پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ جس سے فن ڈراما نگاری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

دوسرا باب:- اردو ڈراما نگاری کا آغاز وارتقا (مختصر جائزہ)

اس میں راقم الحروف نے اردو ڈراما نگاری کا مستند تحقیقی جائزہ لیا ہے جس کے مطالعہ سے یقیناً اردو کے پہلے ڈراما نگار سے لیکر بہار اور دیگر صوبوں کے تمام ڈراما نگاروں کا تعارف بحسن خوبی ہو جاتا ہے۔ جو دراصل ادبی اور تحقیقی حیثیت سے اردو ڈراما کی تاریخ کا ایک اجمالی جائزہ ہے

تیسرا باب:- بہار میں ڈراما نگاری کا آغاز وارتقا (تحقیقی جائزہ)

اس مقالہ کی تکمیل سے بہار کی اردو ڈراما نگاری کی تاریخ کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ جس کی اہمیت اظہر من الشمس ہے چنانچہ اس مقالہ میں، میں نے بہار کے پہلے ڈرامے سے لے کر جدید دور کے تمام ڈراموں کا تحقیقی احاطہ کیا ہے۔ اسکے ذریعہ سے نایاب ڈرامے دریافت و دستیاب ہوئے ہیں جو یقیناً اردو کے بہترین ڈراموں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ سجاد وسنبل اور شمشاد سوسن کی تحقیق سے جہاں بہار کی ڈراما نگاری کی تاریخ کا تعین ہوتا ہے وہیں ان ڈراموں کی اہمیت بھی اجاگر ہو جاتی ہے۔

چوتھا باب:- بہار کے اردو ڈراموں کی قدر و قیمت (تنقیدی جائزہ)

اس مقالے میں ہم نے دو ڈرامے سجاد سنبل اور شمشاد سوسن کی بازیافت کی ہے۔ اور انھیں باقاعدہ طور پر روشناس

کرایا ہے جو دیوناگری رسم الخط میں ہونے کے باعث گمنامی کے
عالم میں تھے۔ اس کے علاوہ بہار کے دوسرے ڈرامے اور
ڈرامانگاروں کے فن کو بھی نمایاں طور پر واضح کرنے کی کوشش کی
ہے۔ جو یقیناً اردو ڈراموں کی تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں

پانچواں باب:۔ اُردو ڈرامانگاری کے ارتقاء میں بہار کا حصّہ۔

اس آخری باب سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ بہار میں نہ صرف
ڈرامے کی تخلیق ہوئی ہے بلکہ ارتقائی دور میں ایسے ڈرامے
لکھے گئے ہیں جو ابتداہی میں اگر منظرِ عام پر آجاتے تو یقیناً
اردو ڈراما کی کم مائیگی کا ذکر نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اردو
ڈرامانگاری کا فن یوں ہی تہی دامن رہتا۔

یہ مقالہ پروفیسر سیّد مظہر اقبال سابق صدر شعبۂ
اردو تِلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسیٹی بھاگلپور کی نگرانی میں
۱۹۸۹ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی کیلئے داخل کیا گیا تھا۔ اور
۱۹۹۰ء میں یونیورسیٹی مذکور نے مجھے ڈگری عنایت فرمائی۔
اس مقالہ کے ممتحن پروفیسر وہاب اشرفی اور پروفیسر حنیف
کیفی جامعہ ملیہ نئی دہلی تھے۔

موجودہ کتاب کی اشاعت میں جن حضرات اور اداروں
سے مجھے بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر مدد ملی ہے ان کا میں
تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

خصوصاً تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسٹی بھاگلپور کا جس نے اس تحقیقی مقالہ کو کتابی شکل میں اشاعت کرنے کیلئے باقاعدہ طور پر اجازت دی اور بہار اردو اکیڈمی پٹنہ کا جس کے مالی تعاون سے یہ کتاب منظر عام پر آسکی۔

اسکے علاوہ محترمی مولانا نیاز الدین قاسمی بمبئی اور استاد محترم جناب پروفیسر ڈاکٹر سید مظفر اقبال سابق صدر شعبہ اردو۔ پی۔جی اردو۔ ٹی۔ایم۔ بھاگلپور یونیورسٹی بھاگل پور کا شکر گذار ہوں جن کی پر خلوص رہنمائی ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہمیشہ کی طرح اپنی اہلیہ شمیمہ خاتون۔ایم۔اے۔ڈپ۔ان ایڈ اسسٹینٹ ٹیچر بہار کا شکر گذار ہوں جنہوں نے اپنی تمام زندگی کی ساری خواہشات مجھ پر قربان کردیں۔اور میرے لئے ایسی فضا پیدا کی جس سے مجھے ادبی کاموں کو مکمل کرنے کا موقع مل رہا ہے۔

آخر میں جناب مولانا عبدالرحیم راہی گڈاوی کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے کتابت کے فرائض بحسن خوبی انجام دیئے۔

اُمید ہے اردو قارئین خصوصاً طلبار کیلئے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔

مُصنف

ڈاکٹر محمد قاسم

صدر شعبہ اردو بی۔این۔کالج بھاگلپور بہار

۱۔ ڈراما نگاری کا فن

ڈراما نگاری ایک قدیم فن ہے۔ ادب کی تمام صنفوں میں ڈرامے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس کی اہمیت بہت ہی دلکش انداز میں واضح کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"ادب نے دنیا میں بڑے بڑے کام کئے ہیں ہنستوں کو رلانا اور روتوں کو ہنسا دینا، دوستوں کو دشمن، دشمن کو دوست بنانا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ بگڑی بات کو، سنوارنا اور صاف اور سیدھی باتوں کو بگاڑنا ایک کھیل ہے۔ ایک ذراسی بات میں ہزاروں کا سر کٹوا دینا اور لاکھوں کا خون بہا دینا، اور لمحہ میں دو مخالفوں اور جانی دشمنوں میں جھٹ پٹ صلح کرا دینا اس کیلئے کوئی مشکل ہی نہیں۔ وہ تلوار کا مقابلہ زبان سے اور نیزوں کا مقابلہ قلم سے کرتا ہے اور اپنے زور سے جدھر چاہتا ہے دنیا کو

کھینچ لے جاتا ہے۔ لیکن اس کی دو قسمیں
ہیں :۔ نظم اور نثر اور ان کی بھی بیسیوں قسمیں
ہیں۔ لیکن ان سب میں موثر اور کارگر
کوئی ہے تو "ڈراما" ہے :۔ ع۱

دنیا کے دوسرے بڑے ادیبوں اور دانشوروں نے بھی ڈرامے کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ اور اسے دیگر اصناف ادب کے مقابلے میں انسانی خیالات کے اظہار کا موثر ترین ذریعہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے مایہ ناز ڈراما نگار آغا حشر کاشمیری نے ڈراما کی اہمیت کو یوں بیان کیا ہے۔

"ناٹک بھی سوئے ہوئے لوگوں کو جگانے
اور گرے ہوؤں کو اٹھانے کا ایک زبردست
ذریعہ ہے۔ جو ترقی کا جوش اور اصلاح کا
جذبہ سیکڑوں وعظ اور ہزاروں لیکچر
سُن کر برسوں میں پیدا نہیں ہوتا۔ وہ
جوش اور جذبہ انسان کے اندر بہتر طور پر
ناٹک ایک رات میں پیدا کر دیتا ہے"

اس لیے دنیا کی تمام زبانوں کے ادب میں ڈراما بہت ہی مقبول ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عالمی سطح پر ادب کے آغاز و ارتقاء میں ڈرامے کا بہت ہی اہم اور موثر رول رہا ہے۔

ع۱ مقدمات عبدالحق۔ مصنف مولوی عبدالحق۔ ص ۱۸۶

ہر فنکار کی طرح ڈراما نگار بھی کسی نہ کسی مقصد کی ترجمانی کیلئے ڈراما کی تخلیق کرتا ہے اور اپنے مقصد کی وضاحت کیلئے زندگی کے مختلف حالات و حادثات سے چند واقعات کو چن کر ڈرامے کی شکل میں پیش کر دیتا ہے۔ اس لئے بعض ناقدین ادب کا خیال ہے کہ ڈراما وہ فن ہے جس میں زندگی کے حقائق کو منعکس کیا جاتا ہے۔

قدیم و جدید ڈراموں کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ڈراما کے اجزائے ترکیبی کم و بیش مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) پلاٹ:- ڈرامے میں جو واقعہ پیش کیا جاتا ہے اس کی ایک خاص ترتیب ہوتی ہے۔ جس کو اصطلاح میں پلاٹ کہتے ہیں۔ ڈرامے کے پلاٹ میں ایک ایسے واضح تسلسل کا پتہ چلتا ہے جس کو ڈرامائی خط کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں اس ڈرامائی خط میں عام طور پر پانچ ایسے نقطوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جو پلاٹ کے تسلسل کے پانچ مراحل کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ مراحل مندرجہ ذیل ہیں۔

(الف) آغاز (ب) ارتقا ریا روئیدگی (ج) عروج (د)، تنزّل یا تقابلِ عروج (ہ) انجام۔

اِن مراحِل کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے

(الف) آغاز:-

ڈرامے کا آغاز کسی واقعے یا حادثے کی تشریح و تعبیر سے ہوتا ہے اس کا اندازِ بیان موثر اور دلکش ہوتا ہے۔ بقول شخصے۔ یہ ایک دلکش راگ کے مانند ہے جس طرح ایک ماہر موسیقار دھیمے مگر دلکش انداز میں راگ الاپنے سے پہلے سُر چھیڑتا ہے اور اُسے بتدریج مدھم سے پنچم تک پہنچاتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک کامیاب ڈراما نگار بھی اپنے ڈرامے کا آغاز پُر کیف باوقار اور موثر اسلوب سے کرتا ہے اور بتدریج ارتقا کی منزل کی طرف بڑھتا ہے۔

(ب) اِرتقا۔ یا رویدگی۔

ڈرامے کے ارتقا کے دوسرے مرحلے میں ابتدائی واقعہ یا واقعات پیش آتے ہیں جن میں کشاکش اور تصادم کا آغاز ہوتا ہے یہ تصادم خارجی اور باطنی دونوں طرح کا ہوتا ہے اور اس سے واقعات میں پیچیدگی رونما ہوتی ہے۔ واقعات کی گرہیں لمحہ بہ لمحہ الجھتی چلی جاتی ہیں۔ اس منزل میں مسائل لاتعداد ہوتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا کوئی حل نہیں ہے۔ ڈرامے کا اصل عمل اس کے ابتدائی حصے میں شروع ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کا آغاز پہلے منظر سے ہوتا ہے اور کبھی ڈراما نگار اس کی پیش کش میں تاخیر سے بھی کام لیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ واقعے کے آغاز سے ہی ڈرامے کا ارتقا شروع

ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ پیچیدگیوں کے نشانات بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں اور عمل منزل عروج کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ ارتقا نہایت واضح اور منطقی اسباب و نتائج پر مبنی ہوتا ہے۔

(ج) عُروج

یہ حقیقت ہے کہ متضاد عناصر زیادہ دیر تک کشمکش اور الجھن میں مُبتلا نہیں رہ سکتے۔ ڈرامے کی روئیداد دیر یا سو یر ارتقاء کے ایسے مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں اس کا توازن برقرار رہنا مشکل ہو جاتا ہے ایسے موقع پر حالات کا جھکاؤ کسی نہ کسی طرف ہونے لگتا ہے۔ اسی مقام کو عروج کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

(د) تنزل یا تقابل عروج:۔

نقطۂ عروج کے بعد ہم ڈرامے کی اس منزل میں قدم رکھتے ہیں۔ جہاں ڈراما انجام کی طرف بڑھتا ہے۔ عروج کے بعد تقابلِ عروج کے اس مرحلے سے گرچہ ڈراما نگار تیزی سے گذرتا ہے۔ لیکن اس میں دلچسپی برقرار رہتی ہے کہ حقیقت پر پڑی ہوئی نقاب اٹھنے لگتی ہے۔ اور انتظار کی گھڑیاں ختم ہوتی نظر آتی ہیں۔

(ہ) انجام۔

پلاٹ کا آخری مرحلہ انجام ہوتا ہے۔ اس مقام پر ڈرامے کے واقعات میں ایسے پہلو نمایاں ہوتے ہیں جن سے تکمیل اور انجام کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ دور جدید کے بعض ڈراموں میں اختتام یا انجام کی منزل کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ حقیقت نگاری کے دعویدار نقاد اسی عدم اختتام کا جواز اس بات سے پیدا کرتے ہیں کہ افسانے یا ڈرامے کو زندگی سے ہم آہنگ ہونا چاہیے اور زندگی میں کوئی ایسا مقام نہیں آتا جس کو ہم انجام کہہ سکیں ان کے نظریے کے مطابق ہر مرحلے میں نئے عمل کے آغاز کا امکان پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ بات کسی حد تک صحیح ہے کہ خیالات و تجربات میں اثر و تسلسل قائم رہتا ہے۔ پھر بھی ان میں سے جو حالات و واقعات ڈرامائی شکل میں تبدیل کرنے کیلئے منتخب کئے جاتے ہیں ان میں آغاز و انجام کی واضح حدیں متعین کی جاسکتی ہیں ڈراما نگار اپنے مقصد کیلئے زندگی کے ثابت و سالم اور مکمل نظام حیات سے واقعات کے چند ٹکڑے چن کر ڈرامے میں شامل کرتا ہے۔ جب کہ زندگی میں حالات بذاتِ خود مکمل اور کامل نہیں ہوتے ہیں ان واقعات کی کڑی کو ہم آخری نہیں سمجھ سکتے صرف ہم اُسے نئے واقعات کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ادب میں ایک ادیب اپنے فنکارانہ انداز میں کسی واقعے کا آغاز و انجام متعین کرکے اسے شاہکار بناتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جب ہم اپنی زندگی کے ماضی حال اور مستقبل

پر نظر ڈالتے ہیں تو واقعات و حادثات کی ابتدا اور انتہا یا آغاز و انجام کی کامیابی کے لئے انجام کے اسباب کو متعین کر کے ہی کچھ اخذ کرتے ہیں۔ انجام کار کسی مقصد کے اس پر عمل پیرا ہونے کا آغاز کرتے ہیں اور یقینی طور پر وہ واقعات انجام کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ انجام، ترتیبِ واقعہ کا ایک فطری نتیجہ ہے

ترتیبِ واقعہ یا پلاٹ کے یہ واضح مراحل ہیں لیکن ابتدائی مرحلے سے پیشتر ایک اور مرحلہ بھی ہوتا ہے جو بہت واضح نہیں ہوتا پھر بھی ابتدائی منظر کے طور پر اسے پیش کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ترتیبِ واقعہ کے چھ مراحل قرار پاتے ہیں۔ جنہیں اگر ہم گراف کی شکل میں پیش کرنا چاہیں تو مندرجہ ذیل کے نقشے کے مطابق پیش کر سکتے ہیں

نقشہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔
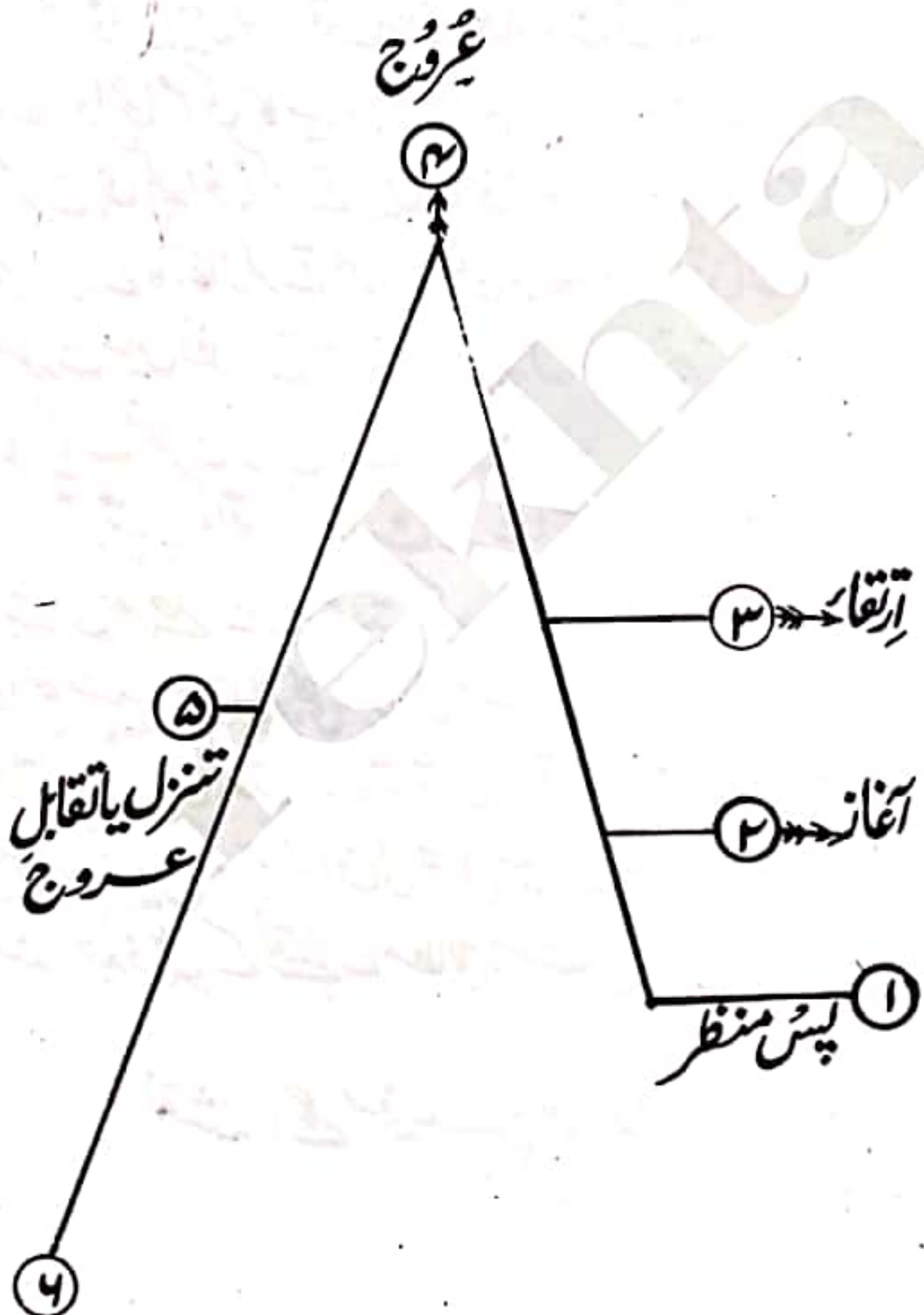
عُروج
۴
ارتقاء
۳
آغاز
۲
۱
پس منظر
۵
تنزل یا تقابلِ عروج
۶
انجام
۱ پس منظر ۲ آغاز ۳ ارتقا یا روئیدگی
۴ عروج ۵ تنزل یا تقابلِ عروج ۶ انجام۔

(۲) کردار نگاری۔

ڈرامے کی دلکشی اور دلچسپی کا انحصار کہانی پر ہے۔ ارسطو نے بھی اس بات کی تائید کی ہے، لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ محض کہانی ہی ڈرامے کیلئے سب کچھ نہیں ہے۔ بعض نقادوں نے کہانی کی اہمیت اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کی ہے کہ دوسرے عناصر دھندلے پڑ گئے ہیں۔ انھوں نے کہانی کے مقابلے میں کردار کو ادنیٰ درجہ کی چیز قرار دیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ ڈرامے میں کردار کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

بقول ہنری آرتھر۔

"بچوں کی طرح تھیٹر کے تماشائیوں کا مصنف سے اولین تقاضہ ہمیشہ یہی ہوگا کہ ہمیں کہانی سناؤ۔ لیکن تھیٹر کی تصنیف میں کہانی کے واقعات اور حالات کا جب تک کرداروں سے گہرا تعلق نہ ہوگا وہ لغو اور بے معنی چیز ہو جائیگی۔ اسے محض کرداروں کے ارتقاء کی نمائش کا وسیلہ ہونا چاہیئے۔" ؏

ڈرامے میں کردار نہ ہوں تو محض کہانی کے بل پر ڈراما کامیاب نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈراما کے فن میں کردار نگاری ایک بنیادی اور مستقل عنصر ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے ڈراما نگاروں نے اپنے ڈراموں کو اپنے کرداروں کے ذریعہ ہی مقبول اور کامیاب بنایا ہے۔ ڈراما نگار کردار کو ہمارے سامنے ان کے قول و فعل کے ذریعہ پیش کرتا ہے۔ ڈرامے میں کردار نگاری کا اصل طریقہ یہ ہے کہ مصنف کی شخصیت اپنے کرداروں سے

؏ بحوالہ ڈراما نگاری کا فن۔ مصنف: [illegible]

بالکل علیحدہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی مخلوق کو تھیٹر کے اسٹیج پر اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی اپنی شخصیت پردے کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے اعمال میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کرتا بلکہ عمل کیلئے انھیں مکمل آزادی دیتا ہے۔ اور وہ بات چیت کے ذریعہ اپنی ذات کے نہاں خانوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اور دیکھنے والوں کو اپنی فطرت سے روشناس کراتا ہے اس طریقہ کار سے ڈراموں کے کردار کے اعمال فطری نظر آتے ہیں۔ چنانچہ باکمال ڈرامانگاروں کے تخلیق کیے ہوئے کردار زندہ انسانوں کی طرح چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

ہر عمدہ ڈرامے میں کردار پلاٹ کے ماحول کو پیدا کرتا ہے جس سے کہانی میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ پلاٹ اور کردار کا امتزاج محض اتفاقیہ طور پر نہیں ہوتا بلکہ یہ مانوس ترین کیمیاوی تحلیل کے ذریعہ وجود میں آتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈرامے میں پلاٹ اور کردار کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہوتا بلکہ مکمل ہم آہنگی ہوتی ہے۔

فن ڈرامانگاری کے ایک مشہور ماہر اسٹیونسن نے کردار اور پلاٹ کے باہمی رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈراما میں ان کی پیش کش کے مختلف طریقوں کی وضاحت کی ہے۔ اس بیان کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(ا) ایک طریقہ یہ ہے کہ پلاٹ کا نقشہ شروع سے ہی مصنف کے ذہن میں ہو۔ وہ اس کے آغاز و انجام اسکے نشیب و فراز سے واقف

ہو۔ کہانی کے ہر موڑ سے آشنا ہو اور پلاٹ کے مطابق کردار کو تراش خراش
کرکے پیش کرے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسکی نظر میں کوئی کردار یا کرداروں کا ایک گروہ
ہو۔ وہ ان کی شخصیتوں کے ہر پہلو کو جانتا پہچانتا ہو۔ ان کے ذہنی رجحانات
ان کے شعور و تحت الشعور کی الجھنیں اسکی نگاہ میں ہوں اور ان کی نمائش
کیلئے وہ ان کی سیرت کا خاکہ پیش کرے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کرداروں کو کسی خاص فضا یا کسی
خاص نقطہ نظر کے مطابق تراشے اور اس کے زیر اثر انہیں پیش کردے۔[1]

زیادہ تر ڈرامے پہلے اور دوسرے طریقہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس لئے
تیسری صورت ناممکن سی ہوتی ہے۔ قدیم یونانی ڈراموں اور سنسکرت
ڈراموں میں یہی اصول کارفرما نظر آتے ہیں اور وہ ڈرامے جن میں پلاٹ اور
کردار میں عدم توازن ہوتا ہے صحیح طور پر کامیاب نہیں ہوتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ کسی ڈرامے کی کامیابی کیلئے کردار نگاری بہت
ہی ضروری عنصر ہے۔ عام طور پر قصے کی ترتیب کردار ہی کے ذریعہ عمل
میں آتی ہے۔ ڈرامانگار واقعات کا کردار کے ساتھ اس طرح تعلق پیدا
کرتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ کسی بھی
ڈرامے میں دو قسم کے کردار پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت
ڈرامے کے واقعات میں مرکزی ہوتی ہے اور دوسرے وہ جن کی حیثیت
ضمنی ہوتی ہے۔ مرکزی کردار ڈرامے کے پلاٹ میں شروع سے آخر تک

---

[1] بحوالہ [illegible] اسلم قریشی، ص ۲۱۳ [illegible] ص ۲۱۴

بالکل علیحدہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی مخلوق کو تھیٹر کے اسٹیج پر اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی اپنی شخصیت پردے کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے اعمال میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کرتا بلکہ عمل کیلئے انھیں مکمل آزادی دیتا ہے۔ اور وہ بات چیت کے ذریعہ اپنی ذات کے نہاں خانوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اور دیکھنے والوں کو اپنی فطرت سے روشناس کراتا ہے اس طریقہ کار سے ڈراموں کے کردار کے اعمال فطری نظر آتے ہیں چنانچہ باکمال ڈرامانگاروں کے تخلیق کیے ہوئے کردار زندہ انسانوں کی طرح چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

ہر عمدہ ڈرامے میں کردار پلاٹ کے ماحول کو پیدا کرتا ہے جس سے کہانی میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ پلاٹ اور کردار کا امتزاج محض اتفاقیہ طور پر نہیں ہوتا بلکہ یہ مانوس ترین کیمیادی تحلیل کے ذریعہ وجود میں آتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈرامے میں پلاٹ اور کردار کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہوتا بلکہ مکمل ہم آہنگی ہوتی ہے۔

فن ڈرامانگاری کے ایک مشہور ماہر اسٹیونسن نے کردار اور پلاٹ کے باہمی رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈرامامیں ان کی پیشکش کے مختلف طریقوں کی وضاحت کی ہے۔ اس بیان کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(۱) ایک طریقہ یہ ہے کہ پلاٹ کا نقشہ شروع سے ہی مصنف کے ذہن میں ہو۔ وہ اس کے آغاز وانجام، اسکے نشیب و فراز سے واقف

ہو۔ کہانی کے ہر موڑ سے آشنا ہو، پلاٹ کے مطابق کردار کو تراش خراش کر کے پیش کرے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسکی نظر میں کوئی کردار یا کرداروں کا ایک گروہ ہو۔ وہ ان کی شخصیتوں کے ہر پہلو کو جانتا پہچانتا ہو۔ ان کے ذہنی رجحانات ان کے شعور و تحت الشعور کی الجھنیں اسکی نگاہ میں ہوں اور ان کی نمائش کیلئے وہ ان کی سیرت کا خاکہ پیش کرے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کرداروں کو کسی خاص فضا یا کسی خاص نقطہ نظر کے مطابق تراشے اور اس کے زیر اثر انہیں پیش کردے۔[1]

زیادہ تر ڈرامے پہلے اور دوسرے طریقہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس لئے تیسری صورت ناممکن سی ہوتی ہے۔ قدیم یونانی ڈراموں اور سنسکرت ڈراموں میں یہی اصول کارفرما نظر آتے ہیں اور وہ ڈرامے جن میں پلاٹ اور کردار میں عدم توازن ہوتا ہے صحیح طور پر کامیاب نہیں ہوتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ کسی ڈرامے کی کامیابی کیلئے کردار نگاری بہت ہی ضروری عنصر ہے۔ عام طور پر قصے کی ترتیب کردار ہی کے ذریعہ عمل میں آتی ہے۔ ڈرامانگار واقعات کا کردار کے ساتھ اس طرح تعلق پیدا کرتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ کسی بھی ڈرامے میں دو قسم کے کردار پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت، ڈرامے کے واقعات میں مرکزی ہوتی ہے اور دوسرے وہ جن کی حیثیت ضمنی ہوتی ہے۔ مرکزی کردار ڈرامے کے پلاٹ میں شروع سے آخر تک

---

[1] بحوالہ ڈرامانگاری کا فن۔ مصنف محمد اسلم قریشی صفحہ ۲۱۳۔ اور صفحہ ۲۱۴

موجود رہتے ہیں۔ وہ پورے ڈرامے پر حاوی ہوتے ہیں ان میں وہ کردار بھی ہوتے ہیں جن کے عادات وخصائل پسندیدہ ہوتے ہیں اور وہ بھی ہوتے ہیں جن کے حرکات وسکنات ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ پسندیدہ عادات وخصائل کے مرکزی کرداروں کو ہم ہیرو اور ہیروئن کا نام عطا کرتے ہیں اور ناپسندیدہ حرکات وسکنات کے حامل کرداروں کو رقیب (villain) کا لقب دیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے بڑے کردار ہوتے ہیں جو مرکزی کردار کو مدد پہنچاتے ہیں اور ان کی سیرت کی تعمیر وتشکیل میں حصہ لیتے ہیں۔ ایسے کردار کو اصطلاح میں ضمنی کردار کہا جاتا ہے۔

(۳) مکالمہ۔

مکالمہ بھی ڈرامے کا ایک اہم عنصر ہے۔ اس کے بغیر ڈراما وجود میں ہی نہیں آسکتا۔ مکالمے کیلئے ضروری ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ کافی غور وفکر کے بعد ترتیب دیا جائے۔ جو کردار کی سیرت کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتا ہو اس کے ذریعہ کردار کی سیرت وشخصیت کو سامعین کے کے سامنے بے نقاب کیا جاسکتا ہے۔ ڈرامے میں مکالموں کی بھر مار سے کردار نگاری پر ناگوار اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح مکالمے کے بے جا اختصار سے بھی کردار کی سیرت پورے طور پر نمایاں نہیں ہو پاتی۔ مختصر یہ ہے کہ مکالموں کے عدم توازن سے ڈرامے کے کردار اور پلاٹ پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مکالمہ ڈرامے کا ایک ضروری اور اہم حصہ ہے اس سے جہاں پلاٹ کی دلچسپی برقرار رہتی ہے وہیں کردار میں انفرادی اوصا

موجود رہتے ہیں ۔ وہ پورے ڈرامے پر حاوی ہوتے ہیں ان میں وہ کردار بھی ہوتے ہیں جن کے عادات وخصائل پسندیدہ ہوتے ہیں اور وہ بھی ہوتے ہیں جن کے حرکات وسکنات ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ پسندیدہ عادات وخصائل کے مرکزی کرداروں کو ہم ہیرو اور ہیروئن کا نام عطا کرتے ہیں اور ناپسندیدہ حرکات وسکنات کے حامل کرداروں کو رقیب (VILLAIN) کا لقب دیا جاتا ہے ۔ ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے بڑے کردار ہوتے ہیں جو مرکزی کردار کو مدد پہنچاتے ہیں اور ان کی سیرت کی تعمیر وتشکیل میں حصہ لیتے ہیں ۔ ایسے کردار کو اصطلاح میں ضمنی کردار کہا جاتا ہے ۔

(۳) مکالمہ ۔

مکالمہ بھی ڈرامے کا ایک اہم عنصر ہے ۔ اس کے بغیر ڈراما وجود میں ہی نہیں آسکتا ۔ مکالمے کیلئے ضروری ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ کافی غور وفکر کے بعد ترتیب دیا جائے ۔ جو کردار کی سیرت کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتا ہو اس کے ذریعہ کردار کی سیرت وشخصیت کو سامعین کے کے سامنے بے نقاب کیا جاسکتا ہے ۔ ڈرامے میں مکالموں کی بھرمار سے کردار نگاری پر ناگوار اثر پڑتا ہے ۔ اسی طرح مکالمے کے بے جا اختصار سے بھی کردار کی سیرت پورے طور پر نمایاں نہیں ہو پاتی ۔ مختصر یہ ہے کہ مکالموں کے عدم توازن سے ڈرامے کے کردار اور پلاٹ پر بہت برا اثر پڑتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ مکالمہ ڈرامے کا ایک ضروری اور اہم حصہ ہے اس سے جہاں پلاٹ کی دلچسپی برقرار رہتی ہے وہیں کردار میں انفرادی اوصا

بھی نمایاں ہو نہ ہیں۔ مکالمے کی اہمیت واضح کرتے ہوئے عشرت رحمانی نے مکالمے کے حسن و قبح کے متعلق جو باتیں بیان کی ہیں وہ بہت ہی اہم ہیں اس لیے انھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

وہ باتیں جو مکالمے کیلئے معیوب ہیں۔

(۱) مشکل زبان، الجھے ہوئے فقرے اور ژولیدہ بیان۔

(۲) بے موقع و بے ربط الفاظ جو کردار اور ماحول کے لیے موزوں نہ ہوں۔

(۳) طویل تقریریں، لمبے فقرے اور بے جا واعظانہ پند و نصائح کا انداز

(۴) خود کلامی کی افراط یا طویل خود کلامی

وہ باتیں جو مکالمے کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں۔

(۱) موزوں و مناسب اور سلیس و فصیح زبان

(۲) سادہ اور مختصر گفتگو جس میں عمل کی حرکت موجود ہو، عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ موقع و محل کے لحاظ سے مناسب ادائیگی کے قابل ہو۔

(۳) برمحل، برجستہ اور چست فقرے، جن میں کردار نگاری کا پورا لحاظ رکھا جائے اور جو سلاست و فصاحت کے آئینہ دار ہوں[1]

مکالمہ حقیقتاً کسی شخص کے مزاج کو سمجھنے کا ایک وسیلہ ہے اس کے علاوہ ڈراما نگار اپنا مقصد و مدعا کرداروں کے مکالموں کے ذریعہ ہی پیش کرتا ہے۔ اس لیے ڈرامے کی کامیابی کے لئے مکالمہ بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔

---

[1] اردو ڈرامے کا ارتقاء۔ مصنف عشرت رحمانی ص ۲۳

عام طور پر ڈرامے میں تین قسم کے مکالمے پائے جاتے ہیں

(۱) ایک کردار کی دوسرے کردار کے ساتھ گفتگو۔

کسی کردار کی گفتگو اس کے اعمال و اطوار کے مطابق ہوتی ہے۔ کردار اپنی زبان سے اپنی ذات کے متعلق موزوں الفاظ اگر نہ بھی ادا کرتا ہو، اس کے باوجود اس کی باتوں سے اس کے مقصد کا پتہ ضرور، چلتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کردار اپنے متعلق غلط بیانی سے کام لیتا ہے اور اپنی اصلیت کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے لیکن بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ کردار کی خصوصیات کا پتہ ہمیں اسکی گفتگو کے ذریعہ ہی لگتا ہے۔

(۲) کسی کردار کے متعلق دوسرے کرداروں کا بیان۔

بعض اوقات ڈرامانگار کسی کردار کی سیرت کے متعلق دوسرے کرداروں سے بیان دلاتا ہے اور ان کے بیانات ہی سے ان کرداروں کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن یہ بہت ہی نازک کام ہے اور اس میں بہت ہی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔

(۳) خود کلامی | اپنے آپ سے گفتگو کرنے یا بول کر سوچنے کے عمل کو اصطلاح میں خود کلامی کہتے ہیں۔ ڈرامے کے کرداروں کی سیرت و، شخصیت کو واضح کرنے کے لئے ڈرامانگار حسبِ ضرورت انھیں خود کلامی پر آمادہ کرتا ہے۔ خود کلامی کے ذریعہ ایک ڈرامانگار کردار کے مقصد اور منصوبوں کو نمایاں کرتا ہے اور اسکی ذات کے نہاں خانوں کا تجزیہ کرتا ہے۔

ڈراموں میں خود کلامی کے ذریعہ کردار کے عملی منصوبوں کی وضاحت کی جاتی ہے اور ان کے قلبی واردات و احساسات کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

اسٹیج

ڈرامے کا اسٹیج سے براہِ راست تعلق ہے اس لئے کہ ڈراما قصے کی وہ صنف ہے جسے حرکت و عمل کے ذریعہ سامعین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ جس زبان کے ڈراموں کا تعلق اسٹیج سے استوار نہیں ہو سکا اس زبان و ادب میں اس فن نے خاطر خواہ ترقی نہیں کی حقیقتاً اسٹیج ڈرامے کیلئے ایک ضروری عنصر کی حیثیت رکھتا ہے اور بغیر اسٹیج کے ڈرامے کا فن ترقی کی منزل طے ہی نہیں کر سکتا۔

اردو میں ڈراما نگاری کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ شروع سے ہی اس کا تعلق اسٹیج سے استوار رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی اسے شاہی اسٹیج میسر ہوا تو کبھی عوامی اسٹیج نے اِسے سہارا دیا۔ البتہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اسٹیج کی نوعیت بھی بدلتی رہی ہے سینما اور ٹیلی ویژن کی ایجاد نے اسٹیج کی نوعیت میں طرح طرح کی تبدیلیاں پیدا کی ہیں اس کے علاوہ ریڈیو نے محض آواز کے ذریعہ ڈراموں کو پیش کرنے کا تجربہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسٹیج کی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ اس لئے ریڈیائی ڈراموں سے زیادہ موثر وہ ڈرامے ثابت ہو رہے ہیں جو ٹیلی ویژن کے ذریعہ پیش کئے جاتے ہیں اس لئے کہ ریڈیائی ڈراموں سے صرف ہماری قوت سامعہ متاثر ہوتی ہے جبکہ ٹیلی ویژن کے ڈراموں سے ہماری

قوت سامعہ کے ساتھ ساتھ قوت باصرہ بھی متاثر ہوتی ہے ۔

ڈراما کے اقسام

مجموعی طور پر ڈرامے کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ڈرامے مختلف قسم کے پلاٹ پر مبنی ہوتے ہیں بعض ڈراموں کے پلاٹ سنجیدہ اور غمگین ہوتے ہیں تو بعض کے پلاٹ مسرت افزا و شگفتہ ہوتے ہیں ان ڈراموں کو اصطلاح میں علی الترتیب المیہ اور طربیہ کا نام دیا جاتا ہے لیکن بعض ڈرامے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی کہانی بیک وقت رنج والم اور مسرت و شادمانی کے جذبات سے مملو ہوتی ہے ۔ ایسے ڈراموں کو المناک طربیہ یا طربناک المیہ کا نام دیا جاتا ہے ۔

المیہ ایسے ڈراموں کو کہتے ہیں جن کے قصے کا انجام المناک ہوتا ہے عموماً ڈرامے میں غم والم کی کیفیتوں کو مندرجہ ذیل طریقوں پر پیش کیا جاتا ہے

بعض ڈرامے ایسے ہوتے ہیں جن کے آغاز میں طربیہ کیفیت ہوتی ہے اور باقی حصوں میں غم کی کیفیت ہوتی ہے اور انجام بھی غم ناک ہوتا ہے ۔

بعض ڈرامے میں ابتدائی مرحلے سے درمیانی مرحلے تک طربیہ کی کیفیت رہتی ہے لیکن انجام غم ناک ہوتا ہے ۔

بعض المیہ ڈرامے میں شروع سے آخری مرحلے تک طربیہ کی کیفیت برقرار رہتی ہے لیکن صرف انجام غم ناک ہوتا ہے ۔

طربیہ طربیہ ایسے ڈرامے کو کہتے ہیں جس میں قصے کا انجام مسرت

وانبساط پر ہوتا ہے۔ قدیم وجدید دور میں طربیہ ڈرامے بہ کثرت ملتے ہیں۔ ان میں نیکی و بدی کی جنگ ہوتی ہے۔ شروع میں ایسا لگتا ہے کہ نیکی پر بدی حاوی ہے۔ لیکن انجام ایسا نہیں ہوتا ہے بلکہ ڈرامے کے اختتام تک نیکی بدی کو شکست دے دیتی ہے اور قارئین کے دل و دماغ میں خوشی و انبساط کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔

المناک طربیہ المناک طربیہ ایسے ڈرامے کو کہتے ہیں جس میں قصے کا انجام المناک ہوتا ہے۔ ارسطو نے المناک طربیہ کو خاص اہمیت دی ہے یونانی ڈراموں میں اس قسم کے ڈرامے ملتے ہیں۔ المناک طربیہ ڈراما لکھنے کیلئے بہت ہی احتیاط اور تجربے کی ضرورت ہے۔ المیہ اور طربیہ کی آمیزش سے ڈرامے کی دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے۔ جدید دور میں اس طرح کے ڈرامے زیادہ لکھے جا رہے ہیں۔

میلو ڈراما یہ المیہ اور طربیہ سے ملتی جلتی ڈرامے کی ایک الگ صنف ہے۔ میلو ایک یونانی لفظ ہے۔ جس کے معنی گیت کے ہیں اس میں گیتوں اور نغموں کی کثرت ہوتی ہے۔ اردو میں بھی میلو ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ اردو اسٹیج او پیرا ہی سے شروع ہوا تو زیادہ صحیح بات ہوگی۔ چنانچہ واجد علی شاہ اختر نے اپنے اوپیرے کا نام "رہس" رکھا جو ہندوستان کے کونے کونے میں مشہور رہا۔ یہ اور بات ہے کہ اس قسم کے ڈراموں میں تاثیر کا فقدان ہوتا ہے لہٰذا فنی اعتبار سے اس قسم کے ڈراموں کی اہمیت کم ہوتی ہے۔

فارس (FARCE)

یہ سنجیدہ ڈراموں کے برعکس غیر سنجیدہ اور ظریفانہ نوعیت کے ڈرامے ہوتے ہیں جن میں مبالغہ آمیز اور لایعنی واقعات و کردار کے ذریعہ تماشائیوں کے لئے تفریح کا سامان پیدا کیا جاتا ہے۔

نکڑ ناٹک جدید دور میں نکڑ ناٹک کا چلن عام ہو گیا ہے اس میں چند کردار کے ذریعہ سڑک کے کنارے گاؤں قصبوں میں سماجی مسائل پر مبنی ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔ اس کا خاص مقصد سماج اور عوام کو برائی سے آگاہ کرنا ہوتا ہے۔ اس ڈرامے کا اثر بہت اچھا پڑتا ہے چنانچہ سماج میں تلک، جہیز، رشوت خوری، قومی یکجہتی وغیرہ موضوع پر ڈرامے لکھے اور کھیلے جاتے ہیں

ڈرامے نظم اور نثر دونوں میں لکھے گئے اس لئے ہیئت کے اعتبار سے انھیں ہم دو حصوں میں بانٹ سکتے ہیں (۱) منظوم ڈرامے ،، اور (۲) منثور ڈرامے ،، اردو کے بعض محققین اور ناقدین نے ڈراموں کی تقسیم ان کے موضوع کی بنیاد پر بھی کی ہے۔ اور انھیں ملکوتی، طلسماتی، مذہبی، اصلاحی، سیاسی، تبلیغی، اور مزاحیہ ڈراموں کا نام دیا ہے۔

اس کے علاوہ حجم کے اعتبار سے بھی ڈراموں کو دو حصوں میں بانٹا جاتا ہے۔ طویل ڈرامے اور مختصر ڈرامے۔ عام طور پر طویل ڈرامے مختلف ابواب پر مشتمل ہوتے ہیں اور مختصر ڈرامے یک بابی ہوتے ہیں

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجاد نے ڈراموں کی ہیئت میں کچھ ترمیم ضرور کی ہے۔ لیکن آج ڈرامے کے فروغ میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا بہت ہی اہم رول ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے ڈراما نگار جو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ڈرامے لکھ رہے ہیں انھیں خاص مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔

✣ ✣ ✣
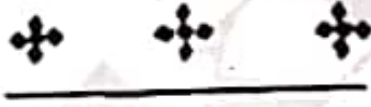
۲ — اردو ڈراما نگاری کا آغاز و ارتقاء

ایک مختصر جائزہ

اردو میں ڈراما نگاری کی کم مائیگی کا ذکر اکثر و بیشتر کیا جاتا رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ ابتداً میں اردو کے جو بھی ڈرامے لکھے گئے ہیں وہ بیشتر دوسرے رسم الخط خصوصاً تلگو، گجراتی، مرہٹی اور دیوناگری میں ہیں۔ اس سلسلے میں "شجیع الدولہ کا ناٹک" اور "مغل تماشا" کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق یہ اردو میں ڈراما نگاری کے ابتدائی دور کے نمونے ہیں۔ یہ دونوں ڈرامے فارسی رسم الخط میں نہیں لکھے گئے اور اسی لیے انہیں عرصۂ دراز تک اردو ڈراما کی تاریخ میں جگہ نہیں ملی۔

"شجیع الدولہ کا ناٹک" کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اردو اور تلگو رسم الخط میں تاڑ کے پتوں پر لکھا ہوا تنجور کے مشہورِ عالم مندر کے سرسوتی محل کتب خانہ میں محفوظ تھا۔ جناب وارانسی رام مورتی رینو پروڈیوسر ہندی پروگرام آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے اسے ہندی رسم الخط میں منتقل کیا ہے[1]۔

یہ اردو ڈرامے کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ یہ ڈراما سترہویں اور سولہویں صدی کے درمیان ہی لکھا گیا ہے۔ اس ڈرامے کے متعلق ڈاکٹر سید مظفر اقبال اپنی کتاب "بہار میں اردو نثر کا ارتقاء" میں لکھتے ہیں۔

---

[1] ماہ نامہ "آج کل" دہلی مارچ ۱۹۸۳ء۔ ص ۳۱

"حال ہی میں دو ڈرامے دریافت ہوئے ہیں۔ایک کا نام "شجیع الدولہ کا ناٹک" اور دوسرے کا "مغل تماشا" ہے۔ان کا تعارف ماہنامہ آجکل دہلی کے شمارہ بابت ماہ مارچ ۱۹۷۸ء اور بابت ماہ جون ۱۹۷۸ء میں علی الترتیب وارانسی رام مورتی اور شیخ مبین اللہ نے کرایا ہے اور انہیں اردو اوپیرا قرار دیا ہے۔یہ دونوں قدیم ڈرامے ہیں۔"شجیع الدولہ کا ناٹک" کا زمانہ گرچہ مقرر نہیں کیا گیا ہے لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تصنیف اٹھارہویں صدی کے آخر میں ہوئی ہے اور "مغل تماشا" بھی اٹھارہویں صدی ہی کی تصنیف بتائی جاتی ہے۔ان بیانات کی تصدیق ابھی باقی ہے۔اس لئے فی الوقت ان کے متعلق کچھ بھی عرض کرنے سے قاصر ہوں[1]"

ابراہیم یوسف نے اپنے مقالے "اردو ڈرامے کے ابتدائی نقوش" میں "شجیع الدولہ کا ناٹک" پر تبصرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> مصنف نے اسے شیواجی کے حکم سے تصنیف کیا جانا بتلایا ہے۔شیواجی کی تخت نشینی ۱۷۶۳ء میں ہوئی اور دیہانت ۱۷۹۶ء میں اس لئے یہ اوپیرا انہیں تاریخوں کے درمیان لکھا گیا ہوگا۔اس لئے اسے اردو کا دستیاب شدہ قدیم اوپیرا تسلیم کرتے ہیں کوئی امر مانع نہیں ہے[2]

[1] بہار میں اردو نثر کا ارتقاء۔مصنف ڈاکٹر سید مظفر اقبال ص ۲۷۰۔۲۷۱
[2] ماہنامہ "التعمیر" ہریانہ بابت ماہ مارچ ۱۹۷۸ء۔ص ۲۱

اسی طرح ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری نے اپنے مقالہ "مغل تماشا" اور اڑیسہ کا اردو اسٹیج" مطبوعہ ماہنامہ آج کل دہلی بابت ماہ فروری ۱۹۸۷ء میں "مغل تماشا" کو اردو کا پہلا ڈراما قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "مغل تماشا کو عوامی ناٹک تسلیم کیا جائے تو اس کے زمانۂ تصنیف کے پیش نظریہ تمثیل گتی نایٹہ یا جاترا کا ابتدائی روپ ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اٹھارہویں صدی میں ڈراما کے ارتقاء کا سورج جرمنی میں طلوع ہوا اور اس فلسفہ خیز زمین نے ۱۷۲۹ء میں لیسنگ Lessing کو پیدا کیا۔ جو بیک وقت عظیم مفکر اور بے مثال ڈراما نگار تھا۔ دوسری طرف بنسی بلبھ گوسوامی کی ولادت ۱۷۲۶ء میں بھدرک (اڑیسہ) میں ہوئی۔ منشی امانت لکھنوی کا سنہ ولادت ۱۸۱۵ء اور "اندر سبھا" کا زمانہ ۱۸۵۳ء ہے۔ "مغل تماشا" کا زمانۂ تصنیف اس سے تقریباً نصف صدی پیشتر ہے۔ اس طرح "مغل تماشا" کو اردو کا اولین ڈراما کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔"[1]

ابتدا میں اردو ڈراما نگاروں کے سامنے معیاری ڈراموں کے فقدان سے اردو ڈراما خاطر خواہ ترقی نہ کر سکا۔ اس کے باوجود مختلف وقتوں میں مختلف جگہوں پر جو ڈرامے تصنیف کیے گئے ہیں یا جنہیں اسٹیج پر کھیلا گیا ہے۔ ان کی تاریخی و ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے واجد علی شاہ اختر کو اردو کا پہلا ڈراما نگار قرار دیا ہے۔ اور ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے ڈاکٹر

[1] ماہنامہ آجکل دہلی بابت فروری ۱۹۸۷ء۔

بھاو واجی لاڈ کو پہلا ڈراما نگار مانا ہے۔ یوں تو یہ دونوں ڈراما نگار تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ امانت لکھنوی کے ڈرامے "اندر سبھا" کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تاریخی اعتبار سے واجد علی شاہ اختر کو ان لوگوں کے درمیان اولیت حاصل ہے لیکن ان کے ڈراما "رادھا کنھیا کا قصہ"، امانت کے ڈراما اندر سبھا اور بھاو واجی لاڈ کے ڈراما "گوپی چند جلندھر" سے بہت پہلے شجیع الدولہ کا ناٹک اور "مغل تماشا" عالم وجود میں آچکے تھے اس لئے اردو ڈراما کی تاریخ میں اب رادھا کنھیا کا قصہ کا ذکر تیسرے نمبر پر آئے گا۔

عشرت رحمانی نے اپنی کتاب اردو ڈراما کا ارتقاء میں بنگال کے ڈراموں اور ڈراما نگاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے "ناگر سبھا" کو بنگال کا پہلا منظوم ڈراما قرار دیا ہے۔ جس کے مصنف شیخ پیر بخش ہیں۔ یہ ناٹک اندر سبھا سے متاثر ہو کر ڈھاکہ میں لکھا اور کھیلا گیا۔ جو کافی مقبول ہوا۔ اور ڈھاکہ ہی میں محمد احمد حسین وافر نے اردو ڈرامے کو ایک نیا موڑ دیا۔ انھوں نے ۱۸۶۸ء میں بیمار بلبل نامی ڈراما لکھا جس میں انھوں نے منظوم و منثور دونوں مکالمے استعمال کئے ہیں اور اسی بنا پر عشرت رحمانی نے اس ڈراما کو اردو کا پہلا نثری ڈراما قرار دیا ہے۔

ایک ڈراما صولت عالم گیری ۱۸۷۱ء میں لکھا گیا ہے۔ جس کے

مصنف مولوی سید ابو الفضل الفیاض ہیں۔ اس ڈرامے کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے تمام مکالمے نثر ہی میں تحریر کیے گئے ہیں اور اس کی زبان خالص اردو ہے۔

گوپی چند اور جالندھر کے بعد اردو ڈراما مغربی ادب سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ اور بمبئی میں اسکی مقبولیت کے بعد بہت سی تھیٹریکل کمپنیوں میں اردو ڈرامے لکھے اور کھیلے گئے۔ ان میں سیٹھ بہرام جی فردون جی مہر زبان آرام قابل ذکر ہیں جنہوں نے خورشید نامی ڈراما لکھا جو اپنے زمانے میں مشہور ہوا۔ اس کے علاوہ نسروان جی مہربان جی نے بہت سے ڈراموں کا ترجمہ کیا اور ساتھ ساتھ نئے ڈراموں کا بھی اضافہ کیا۔ ان ڈراموں میں ہیر رانجھا، باغ و بہار، حاتم طائی، عالمگیر، گل بکاؤلی لیلیٰ مجنوں، نور جہاں، بے نظیر و بدر منیر، لعل و گوہر، علاؤ الدین کا عجیب و غریب چراغ وغیرہ بہت ہی مقبول ہوئے۔ اسی دور میں کئی اور مصنفوں نے بہت اچھے اور معیاری ڈرامے لکھے ہیں۔ ان میں محمد محمود میاں رونق، حسینی میاں ظریف وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی کے بعد ہی ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک اردو ڈراما نگاروں پر جمود کی کیفیت طاری رہی۔ اس جمود کی کیفیت کو آغا حشر کاشمیری نے توڑا۔

آغا حشر کاشمیری کا دور اردو ڈراما نگاری کی تاریخ میں زرین دور ہے۔ کم و بیش آغا حشر نے مسلسل ۳۵ برس اردو

ڈراما کی خدمت کی ہے۔ انھوں نے اپنی فنکارانہ شخصیت اور تخلیقی بصیرت سے اردو ڈراما کو بہت بلند مقام پر پہنچا دیا۔ انھوں نے کل ۳۷ ڈرامے تصنیف کیے ہیں۔ ان کے ڈراموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اردو رسم الخط میں ہی ہندی اور بنگلہ زبانوں کے ڈرامے لکھے ہیں۔ جو بہت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی ڈرامانگار شکیسپیر (Shakespeare) کے ڈراموں کا پلاٹ لے کر اپنے انداز میں بہت سے ڈرامے تصنیف کیے ہیں ان ڈراموں میں آغا حشر کی انفرادیت نمایاں ہے۔ ان کے ڈراموں میں مرید شک، مارِ آستین، اسیر حرص، میٹھی چھری عرف دورنگی دنیا، دامِ حسن عرف ٹھنڈی آگ، شہیدِ ناز عرف اچھوتا دامن سفید خون، صید ہوس، خواب ہستی عرف داؤ پیچ، خوبصورت بلا سلور کنگ عرف نیک پروین، پہلا پیار، بن دیوی، یہودی کی لڑکی بلوا منگل عرف سورداس، شیر کی گرج عرف نعرۂ توحید، مدھر مرلی، بھگیرت گنگا، عورت کا پیار، ہندوستانی لڑکی، ترکی حور، آنکھ کا نشہ سیتا بن باس، بھشم پرتگیاں، دھرمی بالک عرف غریب کی دنیا بھارتی بالک عرف سماج کا پیار، دل کی پیاس اور رستم وسہراب وغیرہ بہت ہی مشہور ہوئے۔ ان ڈراموں میں بعض ڈرامے قومی اور سماجی اصلاح کے لیے لکھے گئے ہیں۔ جن کا اثر عوام پر کافی اچھا پڑا۔ آغا حشر نے اردو ڈرامے کو صحیح معنوں میں عوامی زندگی کا

عکس بنایا اور اسے فکری وفنی ہم آہنگی سے ہم کنار کیا۔ احسن کے بعد ہی ان کے دور میں مختلف ڈراما نگاروں نے ان کا اثر قبول کیا اور اردو ڈراما کو عوامی ڈراما بنانے کی سعی کی۔

محمد حسین آزاد نے اکبر نامی ڈراما لکھا۔ جو اپنی تمثیل نگاری کے اعتبار سے قابلِ توجہ ہے۔ مرزا ہادی رسوا نے بھی ڈرامے تصنیف کیے ہیں جو قابلِ توجہ ہیں۔ ایک مرقع لیلیٰ مجنوں اور دوسرا طلسم اسرار عبدالحلیم شرر نے بھی ڈراما میوۂ تلخ اور شہید وفا ہندوستانی مسلم معاشرے پر مبنی تحریر کیا۔ عبدالماجد دریاآبادی اور ظفر علی خاں نے علی الترتیب زود پشیماں اور جنگ روس کے نام سے ڈرامے لکھے ہیں جن میں وطن پرستی کے جذبے اور سماجی برائیوں کو نمایاں کیا گیا ہے

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے جدید تعلیم سے متاثر ہو کر ڈرامے کے ذریعہ اصلاحی تحریک کو آگے بڑھانے کی سعی کی ہے۔ ان کے ڈرامے راج دُلاری کو انفرادی مقام حاصل ہے۔

اردو میں پریم چند نے کربلا ،، روحانی شادی اور شب تار،، کے نام سے ڈرامے لکھے ہیں۔ لیکن ان کو ڈراما نگاری راس نہیں آئی اس لیے ڈراما نگاری کو خیرباد کہہ دیا۔

تھیٹر کے زوال کے بعد اردو ڈرامے پر بھی زوال کے اثرات نمایاں ہوئے اور تھیٹر کی جگہ سینما نے لے لی۔ اس دورِ زوال میں بھی اردو ڈراما نگاروں نے اردو ڈراما کو ترقی یافتہ بنانے میں جد جہد کی ہے

اور اشتیاق حسین قریشی نے۔ گناہ کی دیوار، ہمراز، صید زبوں، نقش آخر، لکھ کر اردو ڈراما کو جدید اور سائنسی دور کے مطابق بنایا۔

محمد فضل الرحمٰن نے اردو ڈراما کی کم مایگی کا احساس کرتے ہوئے اس صنف پر پوری توجہ دی اور یوروپی ادب کا غایر مطالعہ کیا اور اسی کی روشنی میں انھوں نے ظاہر و باطن یعنی روشنی اور تاریکی، حشرات الارض لکھے۔ یہ تمام ڈرامے رسم پردہ کے خلاف احتجاجی طور پر لکھے گئے ہیں۔ لیکن فنی اعتبار سے یہ ڈرامے کامیاب نہیں ہیں۔ البتہ اس کے بعد ہی ڈاکٹر عابد حسین نے اس موضوع پر ،، پردہ غفلت ،، نامی ڈراما لکھ کر پورے برصغیر کے مسلمانوں کو متاثر کیا۔ یہ ڈراما بہت حد تک ہندوستانی مسلم معاشرے کی اصلاح کیلئے رہنما بنا۔

آغا حشر کے بعد اردو ڈراما نگاروں میں ایک اور ہستی پیدا ہوئی جس نے اردو ڈراما کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ان کا نام امتیاز علی تاج ہے۔ جن کی تخلیق ،، انار کلی کو اردو ڈراما نگاری میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے ڈراموں میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

پروفیسر مجیب نے بھی اردو ڈراما نگاری کی روایت کو ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ انھوں نے حقیقت پسندی کے اصول کو پیش نظر رکھ کر ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کے ڈرامے۔ حبہ خاتون، ہیروئن کی تلاش، آزمائش، خانہ جنگی اور کھیتی وغیرہ اردو کے اہم ڈرامے کہے جا سکتے ہیں۔ ان ڈراموں میں اسٹیج کی کیفیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے علاوہ انکے

دوسرے ڈرامے مثلاً انجام اور دوسری شام بھی قابلِ ذکر ہیں لیکن حبّہ خاتون کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

دنیا کے تمام ادب اور فن پر سائنسی ترقی کا اثر پڑا۔ جس کی بنا پر نئی نئی چیزوں کی ایجاد ہوئی ادب بھی اس سے متاثر ہوا سائنس نے سینما، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجاد کی۔ دنیا کے فنکار بھی اپنے فن کی تبدیلی پر مجبور ہوئے۔ یوں تو اردو اصنافِ ادب میں شامل افسانہ ناول نے جدید تبدیلی کو فوری طور پر قبول کیا۔ دیر سے ہی سہی لیکن اردو ڈراما نگاری بھی اس تبدیلی سے متاثر ضرور ہوئی اور اردو ڈراموں میں ریڈیائی ڈراما، ایک ایکٹ کا ڈراما یعنی یک بابی ڈراما، ٹیلی ڈراما وغیرہ اسی کا نتیجہ ہے۔ اردو کے چوٹی کے فنکار خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، مہندر ناتھ سعادت حسن منٹو، اختر الایمان، ساغر سرحدی، جاں نثار اختر عصمت چغتائی، کیفی اعظمی، ڈاکٹر محمد حسن، پطرس بخاری، سلام مچھلی شہری، راجہ مہدی علی خاں، رفعت سروش، کمار پاشی اسد بھوپالی، کیف بھوپالی، اظہر افسر، ابراہیم یوسف، حبیب تنویر، اور سلیم جاوید وغیرہ نے اسٹیج کے علاوہ فلموں کیلئے بھی ڈرامے اور مکالمے لکھے ہیں۔

بہار میں منشی کیشورام بھٹ، مولوی سید محمد نواب، منشی خواجہ محسن علی مونگیری، منشی زوار حسین، شمس الدین شمس گیاوی

اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، سمیع الحق، طارق جمیلی، شفیع مشہدی، سید ظہیر احسن، شین مظفر پوری، زکی انور، وہاب اشرفی، شمیم فاروقی، اور سید مظفر اقبال وغیرہ نے دور قدیم اور دور جدید میں مکمل اور یک بابی مختصر ڈرامے تحریر کیے ہیں۔ اور اب بھی بہت سارے مصنفین کا قلم حرکت میں ہے۔

۳- بہار میں ڈراما نگاری کا آغاز و ارتقاء

تحقیقی جائزہ:

بہار میں اردو ڈرامے کا نشان ۱۸۷۶ء سے ملتا ہے۔ یہ دور اردو ڈراما نگاری کی ترقی کا دور ہے۔ پورے ہندوستان میں اردو ڈراموں کا دور دورہ تھا۔ تمام صوبوں کی طرح بہار میں بھی مختلف تھیٹریکل کمپنیاں اور ناٹک منڈلیاں قائم ہوئیں جن میں مختلف قسم کے ڈرامے لکھے اور کھیلے گئے۔

"۱۸۷۶ء میں ناٹک منڈلی کا قیام بہار میں عمل میں آیا۔ جس کا نام "ناٹک منڈلی" تھا۔ کیشورام بھٹ نے اسکو قائم کیا اور اس ناٹک منڈلی نے ہندی کے ساتھ اردو اور بنگلہ ڈرامے بھی اسٹیج کئے[1]۔ اور پھر دوبارہ آرہ میں بھی کیشورام بھٹ کے ڈرامے سجاد سنبل اور شمشاد سوسن کھیلے گئے[2]۔"

اس کے علاوہ شری ڈاکٹر اگیات نے اپنی کتاب "بھارتیہ رنگ منچ کا ویوچناتمک اتہاس" میں پٹنہ ناٹک منڈلی کا ذکر یوں کیا ہے۔

"सन १८७६ में पटना नाटक मंडली की स्थापना कर उस के माध्यम से भट्ट जी ने अपना "शमशाद सोसन" नाटक उसी वर्ष दिसम्बर में प्रस्तुत किया" बिहार बन्धु प्रेस में अस्थाई मंच बना कर खेला गया! उसके अनन्तर उन का "सज्जाद सुमबल" मंचस्थ हुआ, जिस के कई प्रयोग हुये!-

---

ع ۱۔ بہار کا ساہتیہ پہلا بھاگ (ہندی) مرتب بابو شیو نندن سہائے صفحہ ۱۱۵

ترجمہ:۔ ۱۸۷۶ء میں ناٹک منڈلی کو قائم کر کے اس کے ذریعہ بھٹ جی نے اپنا "شمشاد سوسن" ناٹک اسی سال دسمبر میں پیش کیا۔ یہ ناٹک بہار بندھو پریس میں عارضی طور پر اسٹیج بنا کر کھیلا گیا تھا۔ اس کے بعد اُن کا "سجاد سنبل" اسٹیج پر پیش کیا گیا جس کے کئی تجربے ہوئے۔ [۱]

اس لحاظ سے پٹنہ ناٹک منڈلی ریاست بہار میں اردو اور ہندی کی پہلی ناٹک منڈلی ہے۔ اس کے بعد ہی بہار میں ڈرامہ نگاری کا رواج عام ہوا۔ منشی کیشو رام بھٹ اپنے دور کے ایک اہم ادیب تھے جنہوں نے مختلف موضوعات پر مختلف زبانوں میں کتابیں لکھی ہیں ان ہی میں وہ دو ڈرامے بھی ہیں جن کی زبان اردو لیکن رسم الخط دیوناگری ہے۔ اب تک کی تحقیق سے ان کے درج ذیل ڈراموں کا پتہ چلا ہے۔

سجاد سنبل | پروفیسر سید حسن صاحب نے اپنے مقالہ "بہار کا اردو اسٹیج اور اردو ڈراما" میں "سجاد سنبل" کو اردو ڈراما قرار دیا ہے۔

"اس ڈرامے کو ہندی تصنیف صرف اس بنا پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ دیوناگری رسم الخط میں ہے۔ ورنہ زبان اور طرز تحریر دونوں کے لحاظ سے سو فیصد اردو تصنیف ہے۔" [۲]

"سجاد سنبل" ۱۸۷۶ء میں لکھا گیا۔ اسے مصنف نے بہار بندھو پریس کے احاطے میں اسٹیج کیا اور خود بھی اداکاری میں حصہ لیا۔ [۳]

۱۔ بہار رنگ منچ کا دیوچناتمک اتہاس۔ مصنفہ ڈاکٹر [illegible] صفحہ ۱۰، ۵۸،

بقیہ حاشیہ نمبر ۲ بہار کا اردو اسٹیج اور اردو ڈراما۔ مصنفہ [illegible] ۵۴

اس ڈرامے کا ایک نسخہ مجھے بھاگلپور بھگوان لائبریری سے دستیاب ہوا ۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے جو اگست سنہ ۱۹۰۴ء میں بھارت مِتر کلکتہ سے شائع ہوا ہے ۔ اس کا سائز (۱۳ x ۲۲ س م) ہے اور کل ۱۴۹ صفحات پر مشتمل ہے ۔

سجاد سنبل کا تیسرا ایڈیشن جس پر تاریخ طباعت و اشاعت درج نہیں ہے ۔ وہ راج بھاشا پریشد لائبریری پٹنہ میں موجود ہے ان دونوں کی عبارت یکساں ہیں اور یہ بھی ۱۴۹ صفحات پر مشتمل ہے ۔

یہ ڈراما پہلی دفعہ شائع ہونے کے بعد ۲۱ برس تک گمنامی کے عالم میں پڑا رہا ۔ ہندی والے اس سے بہت زیادہ مستفید نہیں ہو سکے ۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں اس امید کے ساتھ شائع کیا گیا کہ اب ہندی پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے اور وہ اسکی اہمیت کو سمجھ سکیں گے ۔ اس ایڈیشن کے مرتب کا بیان یوں درج ہے ۔

यह नाटक ऐसे समय मे बना था कि जब हिन्दी के पाठक बहुत कम थे! तथापि दोबारा छपा, किक अब २१ साल से फिर नहीं छपा! इस समय के हिन्दी पाठक इसे जानते भी न थे। इस के रचयिता के महाशय की आज्ञा से फिर छापा जाता है!
अब की आशा है कि बहुत लोग इसे पढ़ेंगे और

صفحہ گذشتہ کا حاشیہ ع ۲ بہار کا اردو اسٹیج اور اردو ڈراما مصنف پروفیسر سید حسن ص ۴۳
ع ۳ بہار کا ساہتیہ پہلا بھاگ (ہندی) مرتبہ بابو سیلو نندن سہائے صفحہ ۱۰

इस की उत्तमता को जानेंगे !

भारत मित्र समपादक -

अगस्त-१९०४ -

ترجمہ: یہ ناٹک ایسے زمانے میں بنا تھا کہ جب ہندی قارئین بہت کم تھے۔ اسکے باوجود دوبارہ شائع ہوا۔ فروخت ہوا۔ اب ۱۲ برسوں سے طبع نہیں ہوا۔ اس زمانے کے ہندی قارئین اسے جانتے بھی نہ تھے۔ اس کے مصنف محترم کے حکم سے پھر شائع کیا جاتا ہے۔ اب اُمید ہے کہ بہت لوگ اسے پڑھیں گے اور اس اعلیٰ تخلیق کو سمجھیں گے۔

بھارت مِتر ناشر۔

اگست ۱۹۰۴ء [1]

بنگال نے سب سے پہلے انگریزی ادب کے اثرات قبول کئے اور بنگلہ کے ادیبوں نے مغرب سے استفادہ کر کے ہندوستانی ادب کو فروغ دینے کی سعی کی۔ چنانچہ ۱۸۷۴ء میں شری کیشو رام بھٹ نے بنگلہ کتاب سرت اور سروجنی کا رویانتر سجاد سنبل کے نام سے کیا۔ خود مصنف نے ۱۹۰۴ء کے ایڈیشن میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

सरत और सरोजनी, को
हिन्दुसतानी लिबास पहन कर अपने -

ع ۱ سجاد سنبل - بھومیکا -

देश वाशियों की सेवा में भजेता हूँ! देखा चाहिये इस देश मे इस का कितना आदर होता है!

"केशवराम भट्ट"

ترجمہ: سرت اور سروجنی" کو ہندوستانی لباس پہنا کر اپنے ملک کے عوام (دیش واشیوں) کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں دیکھا جائے کہ اس ملک میں اسکی کتنی قدر ہوتی ہے۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ اردو کے جو ڈرامے ابتدائی دور میں لکھے گئے ہیں وہ دیوناگری یا دوسرے ہندوستانی رسم الخط میں ہیں چنانچہ اردو کے ابتدائی دور کے ڈرامے "مغل تماشا" اور "شجیع الدولہ کا ناٹک" بھی فارسی رسم الخط میں نہ ہوکر دوسرے رسم الخط میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن زبان و بیان، کردار و ماحول سبھی اردو زبان میں ہیں اور اسی سے اردو ڈرامے کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ بہار میں اردو ڈرامے کا آغاز بھی پنڈت کیشورام بھٹ کے دیوناگری رسم الخط میں تحریر شدہ ڈراما "سجاد سنبل" سے ہوتا ہے۔ کیونکہ زبان کے اعتبار سے یہ بھی اردو ڈراما ہے "سجاد سنبل" بھی حقیقتاً اردو کا ہی ڈراما ہے۔ اس میں انہوں نے زبان و بیان اور ماحول و کردار یہاں تک کہ گیت، غزل اور اشعار تک اردو کے ہی استعمال کئے ہیں۔ جس طرح آغا حشر کاشمیری کے بعض ہندی اور بنگلہ ڈرامے اردو رسم الخط میں ہیں

---

[1] سجاد سنبل - بھومیکا۔

اور اس کے باوجود انہیں ہندی اور بنگلہ کا ڈرامانگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کیشورام بھٹ کو بھی اردو ڈرامانگار تسلیم کیا جانا چاہیے۔

"آغا حشر کاشمیری نے کل ۳۷ ڈرامے تصنیف کئے ہیں جن میں اردو کے علاوہ ہندی او بنگلہ کے بھی ڈرامے ہیں۔ ان ہندی اور بنگلہ کے ڈراموں کی خاصیت یہ ہے کہ وہ سارے کے سارے فارسی رسم الخط میں لکھے گئے ہیں حال ہی میں آغا جمیل کاشمیری نے انہیں دیوناگری رسم الخط میں منتقل کیا ہے"[1]

لیکن ہندی اور بنگلہ کے ناقدین نے شروع سے ہی انہیں ہندی اور بنگلہ کے ڈرامانگاروں کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ چنانچہ ہندی کے ناقد دسرت اوجھا نے اپنی کتاب "ہندی ناٹک کوش" میں آغا حشر کے درج ذیل ڈراموں کو ہندی کے ڈراموں کی حیثیت سے شامل کیا ہے۔

"آنکھ کا نشہ"، یہودی کی لڑکی"، سلور کنگ، اندر سبھا کذا گلفام عرف سبز پری"، عورت کا دل، چنڈی داس"، اور دل کی پیاس"[2]

المختصر رسم الخط کی اہمیت ایک اور مثال سے واضح ہوتی ہے

عہ۱ دھرم ایک ہندو رسالہ شمارہ بابت ماہ اپریل [illegible] - لوک پرونار نگ منچ کے اگردوت :- آغا حشر کاشمیری مصنفہ جمیل عالم جعفری صفحہ ۲۹ - بقیہ صفحہ

शमशाद-सौसन।

(नाटक।)

"दुर्बल को न सताइये जाकी मोटी हाय,
मुई खाल की सांस से सार भस्म होइ जाय।"

कबीर।

• اے زبردست زیر دست آزار •
• گرم تا کے بماند ایں بازار •

सादी।

पटना।

बिहार-बन्धु छापाखाना, बांकीपुर।

१८८०।

(ڈراما "شمشاد سوسن" کا سرورق)

کہ اردو کے نامور شاعر وادیب جناب انشاء اللہ خاں انشار کی مشہور تصنیف "رانی کیتکی"، جو فارسی رسم الخط (اردو) میں لکھی ضرور گئی ہے لیکن زبان و بیان سو فیصد ہندی ہے اور جب تک یہ کتاب اردو رسم الخط میں رہی اسکی افادیت واہمیت سے اردو والے محروم رہے اور پھر جب اسے دیوناگری رسم الخط میں تحریر کیا گیا تو صحیح طور پر ہندی والوں نے اسکی اہمیت کو سمجھا۔ ہندی ادب میں اُسے ابتدائی دور کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

کیشورام بھٹ بہار کے پہلے اردو ڈراما نگار ہیں اور ان کا ڈراما "سجاد سنبل"، بہار میں اس نوع کا پہلا ڈراما ہے۔ یہ ڈراما چھ ایکٹوں پر مشتمل ہے پہلے دوسرے اور تیسرے ایکٹ میں چار چار سین ہیں۔ باقی تین یعنی چوتھے پانچویں اور چھٹے میں پانچ پانچ سین ہیں۔ یہ ایک سبق آموز اخلاقی ڈراما ہے۔

شمشاد سوسن

ڈراما "شمشاد سوسن" بھی منشی کیشورام بھٹ کی تصنیف ہے دراصل یہ ڈراما سنہ ۱۸۷۶ء ہیں ہی لکھا گیا ہے، اور اسی سال ماہ دسمبر میں اسٹیج کیا گیا۔

سنہ ۱۸۷۶ء میں پٹنہ ناٹک منڈلی قائم کر کے اس کے ذریعہ بھٹ جی نے اپنا ڈراما شمشاد سوسن اسی سال دسمبر

حاشیہ صفحہ کا ۳۲ "ہندی ناٹک کوش"، مصنفہ شری دسرت اوجھا سنہ ۱۹۷۵ء (ہندی)

میں پیش کیا۔ ناٹک بہار بندھو پریس میں عارضی طور پر رنگ منچ بنا کر کھیلا گیا ع۱

یہ کتاب بہار بندھو پریس سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۰ء میں ۱۰×۱۵ اس۔ م کے سائز میں طبع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے سرِ ورق پر پریس کا مونوگرام بھی دیا ہوا ہے۔ مونوگرام کے اوپری حصے پر کبیر داس کا یہ دوہا درج ہے

" दुर्बल को न सताइयो जाकी मोटी हाय !
मुई खाल की सांस से सार भसम होइ जाय !!
कबीर दास

ترجمہ۔ دُربل کو نا ستایئو جاکی موٹی ہائے
موئی کھال کی سانس سے سار بھسم ہوئی جائے

کبیر داس ع۲

اسکے نیچے فارسی کے مشہور شاعر شیخ سعدیؒ کا یہ شعر فارسی رسم الخط میں تحریر ہے۔ ؎

اے زبردست زیر دست آزار
گرم تا کے بماند ایں بازار۔ !! (سعدیؒ)

کتاب کے پہلے صفحے پر "بھومیکا" کے عنوان کے تحت مصنف کے درج ذیل جملے تحریر ہیں۔

सुरेन्द्र विनोदनी भुमिका के आशय परयह

ع۱ بھارتیہ رنگ منچ کا ویویچناتمک اتہاس۔ مصنفہ ڈاکٹر اگیات ۱۹۸۰ء صفحہ ۱۵۸
ع۲ شمشاد و سوسن (ہندی) مصنفہ کیشو رام بھٹ سرورق۔

किताब लिखी गई है। जहाँ तक बन पड़ा है वहाँ तक इस में उसके ऐबों को नहीं आने दिया है! क० रा० भ०: 3

ترجمہ۔ سُرینید ر ونیودنی کی بنیاد پر یہ کتاب تصنیف کی گئی ہے جہاں تک ہوسکا ہے وہاں تک اس کو اسکے عیبوں سے مبرا رکھا ہے۔ (کیشورام بھرت)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس ڈرامے کا پلاٹ بنگلہ کتاب سُرینید ر ونیودنی سے ماخوذ ہے۔ لیکن یہ اس کا چربہ یا رو پانتر نہیں ہے۔ جیسا کہ سجاد سنبل ہے۔ کیونکہ مصنف نے بہار کے مقامی اور مسلم گھرانے کی زندگی کا سچا نقشہ بڑے ہی فنکارانہ انداز میں کھینچا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈراما اردو ہی کا ہے۔ کہیں بھی بنگلہ کردار و ماحول کا عکس نمایاں نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اس زمانے میں سر سید اور حالی نے مسلمانوں میں جدید تعلیم حاصل کرنے کی جو مہم چلائی تھی مصنف بھی اس سے متاثر نظر آتا ہے۔ اور اس نے اسکو اس ڈرامے کے پلاٹ کی تکمیل میں بڑے ہی دلچسپ اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ڈرامے میں فن ڈراما نگاری کے تمام عناصر موجود ہیں فی الحقیقت یہ ڈراما بھی اردو ہی کا ہے۔ اس میں زبان و بیان کردار و ماحول یہاں تک کہ گیت، غزل، اور اشعار بھی اردو کے ہی

استعمال کئے گئے ہیں۔

یہ ڈراما کل ۱۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں چار ایکٹ ہیں۔ پہلے ایکٹ میں چھ سین ہیں۔ دوسرے اور تیسرے میں چھ چھ سین ہیں البتہ چوتھا اور آخری ایکٹ ایک ہی سین پر ختم ہوتا ہے۔

مصنف نے بڑے دلکش و دلچسپ انداز میں اس ڈرامے کا آغاز حالی کی اس نظم سے کیا ہے۔ جو اس ڈرامے کی ہیروئن کی زبانی پیش کی گئی ہے۔

نظم

تنزل نے کی ہے بری گت ہماری
بہت دور پہونچی ہے نکبت ہماری

گئی گذری دنیا سے عزت ہماری
نہیں کچھ ابھرنے کی صورت ہماری

پڑے ہیں اک امید کے ہم سہارے
توقع میں جنت کی جیتے ہیں سارے

ہم ہی ہیں وہ نسلیں مبارک ہیں جن کی؟
کہ بخشیں گے جو دین کی استواری؟
کریں گے ہم ہی قوم کی غم گساری؟
ہم ہی پر امیدیں ہیں موقوف ساری؟

ہم ہی شمع اسلام روشن کریں گے؟
بڑوں کا ہم ہی نام روشن کریں گے؟

حالی

یہ ڈراما جدید فن ڈراما نگاری کے اعتبار سے بھی کامیاب ہے اس کے علاوہ عبدالعلیم نامی نے اپنی کتاب "اردو تھیٹر" میں کیشوررام بھٹ کا ایک اور ڈراما "اندھوں کو آنکھ" کا ذکر کیا ہے۔

جہاں بخت و شمس النہار

مولوی سید نواب محمد دوسرے ڈراما نگار ہیں۔ جن کو بہار کے ڈراما نگاروں میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اب تک کی تحقیق سے یہ پتہ چلا ہے کہ انھوں نے صرف ایک ہی ڈراما لکھا ہے جس کا نام "جہاں بخت و شمس النہار" ہے۔ یہ ۱۸۸۴ء میں تحریر کیا گیا ہے۔ یہ ڈراما ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کتاب مطبع احسن المطابع پٹنہ سے شائع ہوئی۔ مصنف نے اس ڈرامے کو بابو دیو ناتھ سہائے رئیس و زمیندار پٹنہ میونسپل کمشنر بانکی پور کے نام منسوب کیا ہے۔ اس ڈرامے میں مصنف نے دیباچہ بھی لکھا ہے جس سے ڈراما نگاری کے متعلق اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔ ان عبارتوں سے ڈراما نگاری کے فن سے مولوی صاحب کی واقفیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

انہوں نے اس زمانے کے رواج کے خلاف اپنے ڈرامے "جواں بخت و شمس النہار" میں مافوق الفطری فضا کو پیش کرنے سے احتراز کیا ہے۔ گو کہ اس ڈرامے کا موضوع عشق و محبت کی المیہ کہانی پر مبنی ہے۔ یہ ڈراما کل چار ایکٹ اور پندرہ سین پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ۱۵×۱۲ س۔م کے سائز میں طبع شدہ ہے۔ اس میں کل ۵۷ صفحات ہیں۔

یہ ایک منظوم ڈراما ہے۔ دراصل یہ ایک اوپیرا اور المیہ ڈراما ہے۔ اس میں قصّے کو گیتوں اور سازوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس ڈرامے کو تھیٹریکل کمپنی نے بھی اسٹیج کیا۔ پروفیسر سیّد حسن صاحبؒ اس ڈرامے کے متعلق لکھتے ہیں۔

ڈراما دراصل مولوی سید محمد نواب مرحوم نے ایک اصلاحی مقصد کے تحت لکھا ہے ہا۱

ناٹک محسن

یہ ۱۸۸۹ء میں پہلی دفعہ شایع ہوا۔ اس کے مصنف خواجہ محسن علی تخلص یہ محسن مونگیری ہیں۔ عبدالعلیم نامی نے اپنی کتاب اردو تھیٹر میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ۲۱×۱۳ س۔م کے سائز میں ہے۔ یہ ڈراما کل ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ ایک منظوم ڈراما ہے۔ البتہ بعض عنوان کے تحت اس میں کہیں کہیں نثر میں مکالمے استعمال ہوئے ہیں

مجموعی طور پر اپنے زمانے کا یہ ایک روایتی ڈراما ہے۔

کھیل طلسمات تقدیر عرف بہرام گور

منشی نوار حسین عرف مرزا عظیم آبادی بہار کے ڈراما نگاروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے صرف ایک ہی ڈراما "کھیل طلسمات تقدیر عرف بہرام گور" کے نام سے لکھا ہے۔ اس ڈرامے کے متعلق پروفیسر مظفر اقبال نے اپنی کتاب "بہار میں اردو نثر کا ارتقاء" میں لکھا ہے کہ۔

مجھے اس ڈرامے کا طبع شدہ نسخہ ملا ہے۔ یہ نسخہ پہلی بار مطبع احمدی واقع پٹنہ محلہ مغل پورہ سے ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں طبع ہوا ہے۔

لیکن راقم الحروف کو بھی اس ڈرامے کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری سے دستیاب ہوا۔ لیکن اسکی طباعت و اشاعت کس ادارے سے ہوئی ہے۔ اس کا نام و پتہ درج نہیں ہے البتہ ڈرامے کے آخری صفحے پر ۲۲ ربیع الآخر ۱۳۱۲ھ درج ہے۔ اس ڈرامے کی عبارت نظم و نثر دونوں ہی میں ہے اس میں ایکٹ کے تحت عنوان کے نام تحریر نہیں کئے گئے ہیں بلکہ یہ مختلف ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں تین ابواب ہیں

اور ہر باب کے مختلف پردے ہیں۔ پہلے باب میں نو دوسرے میں پانچ اور تیسرے میں دس پردے ہیں۔

اس ڈرامے میں بہ یک وقت دو پلاٹ کا استعمال ہوا ہے۔ اس طرح کے پلاٹ بعد میں آغا حشر کے ڈراموں میں کہیں کہیں ملتے ہیں۔ اس حیثیت سے اس ڈرامے کی نوعیت بہار میں اس سے پیشتر لکھے گئے ڈراموں سے مختلف ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ڈراما اسٹیج پر کھیلا بھی جا چکا ہے۔ پروفیسر مظفر اقبال کے بیان کے مطابق اس ڈرامے کو "دی رائل تھیڈریکل کمپنی آف بہار" نے اسٹیج پر پیش کیا تھا۔ یہ ڈراما ۲۴ × ۲۲ س۔م کے سائز کے ۳۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامے میں بہ یک وقت دو قصے ہیں۔ ایک سنجیدہ اور دوسرا ظریفانہ و تفریحی۔ سنجیدہ قصے کا ہیرو بہرام گور ہے اور اسکی ہیروئن دو ہیں۔ حسن بانو پری اور بہرام کی ملکہ۔ رقیب کے کردار بھی دو ہیں۔ ایک آدم زاد بہرام کا وزیر دوسرا دیو زاد مسمّٰی شہنائی اور تفریحی قصے کا ہیرو بہرام کا دوست زاغ۔ ہیروئن بی بھچنگا ہے۔ اس کے علاوہ سلطان عالم اور بکبل کے کردار بھی ملتے ہیں۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق ٹھمری، غزل اور انترا وغیرہ کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔

✣ ✣ ✣

✣ ✣ ✣

گلشن ہیبت شگوفہ حسرت

"ڈراما"گلشن ہیبت شگوفہ حسرت" ۱۸۹۶ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ جس کا نسخہ مجھے چمپانگر بھاگلپور کے ایک علم دوست مخلص کی ذاتی لائبریری سے دستیاب ہوا۔ یہ کتاب ۲۰×۱۳ س۔م کے سائز میں مطبع اخبار شہرۂ آفاق گیا سے مطبوع شدہ ہے۔ یہ کل ۲۸ صفحات اور تین ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں دو پردے ہیں۔ اور دوسرے باب میں کل تین پردے ہیں۔ اور تیسرے باب میں صرف ایک ہی پردہ ہے۔

اس ڈرامے کے مصنف ہری ہر پرساد عرف لال بابو حسرت دیہاتی ہیں۔ جیساکہ اس ڈرامے کے ٹائٹل پیج سے ظاہر ہوتا ہے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اخبار "شہرۂ آفاق" کے نامہ نگار تھے۔ جو ہفتہ وار شہر گیا سے نکلتا تھا۔ اور اس کا آفس محلہ لہیری ٹولہ شہر گیا میں تھا۔ یہ ڈراما پہلے اس اخبار میں قسط وار شائع ہوا۔ پھر باضابطہ کتابی شکل میں مطبع اخبار "شہرۂ آفاق" کے ذریعہ اس کی اشاعت کی گئی ہے۔ مصنف کا مجھے صرف یہی ایک ڈراما حاصل ہو سکا ہے۔ اسکے علاوہ اس ڈرامے سے مصنف کی شاعری اور ڈرامانگاری کی صلاحیت کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور مزاحیہ اور ظریف

شاعر تھے۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنا پورا نام بھی تحریر نہیں کیا ہے۔ بلکہ صرف تخلص حضرت دیہاتی لکھا ہے۔ اس ڈرامے میں جتنے بھی گیت غزل، اور ٹھمریاں استعمال ہوئی ہیں وہ خود مصنف کی تخلیقات معلوم ہوتی ہیں۔ ان صنفوں میں بھی مصنف کا ظریفانہ اور مزاحیہ رنگ نمایاں ہے۔ ساتھ ہی ان ظریفانہ اشعار میں طنز کا عنصر بھی موجود ہے۔ جو اس زمانے کے لوگوں کے برے فعل و عمل پر گہری چوٹ ہے۔ یہ ڈراما حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ بہار کا ایک منفرد ڈراما ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بہار کی ڈرامانگاری کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ بھی ہے۔

شہنشاہ حبشہ

اختر اورینوی کی حیثیت اردو ادب میں ہمہ گیر ہے۔ انہوں نے مختلف صنفوں میں کامیاب تجربے کئے ہیں۔ انہوں نے بیک وقت مختلف اقسامِ ادب میں اپنے کمالات کا اظہار کیا ہے۔ یوں تو انہوں نے ڈرامانگاری کی طرف توجہ کم دی ہے پھر بھی مجھے درج ذیل ڈرامے دستیاب ہوئے ہیں۔ چنانچہ ڈراما "شہنشاہ حبشہ" ۸۰، صفحات پر مشتمل مختصر مگر مکمل ڈراما ہے۔ یہ پانچ ایکٹ پر مشتمل ہے۔ اور پھر ہر ایکٹ میں مختلف مناظر ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں مکتبہ اردو لائبریری لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کا موضوع ۱۹۳۵ء کی تاریخی جنگ میں حبشہ کی تباہی و بربادی

سے ہے۔ یہ ایک ادبی ڈراما ہے۔

زوال کینٹن

ڈراما "زوال کینٹن" اختر اورینوی کا دوسرا ڈراما ہے۔ دراصل یہ یک بابی ڈراما ہے یہ ڈراما تین مناظر پر مشتمل ہے۔ ارتقائی دور کے مختصر و یک بابی ڈراموں میں یہ ڈراما ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ اِسے پٹنہ یونیورسیٹی کے طلبار نے اسٹیج بھی کیا۔

آگ اور پانی

یہ ڈراما "آگ اور پانی" ڈاکٹر طارق جمیلی کا لکھا ہوا ہے۔ مصنف کا یہ پہلا ڈراما ہے اور اپنے انداز بیان کے اعتبار سے یہ علامتی ہے۔ یہ چار سین پر مشتمل ہے۔ مختصر اور کامیاب ڈراما ہے ۱۹۶۰ء میں لیبل لیتھو پریس رمنہ روڈ پٹنہ سے ۱۸×۱۲ س۔م کے سائز میں شائع ہوا ہے۔ یہ ڈراما بزم اردو پورنیہ کالج کے زیر اہتمام پورنیہ کالج میں اسٹیج ہوا۔ اس کو اسٹیج پر پیش کرنے میں پورنیہ کالج کے طلبار نے حصہ لیا تھا۔ یہ کل ۳۸ صفحات مشتمل ہے۔

یہ ڈراما جنگ اور امن کے موضوع پر مبنی ہے۔ دراصل یہ ڈراما اقبالؔ کے اس شعر کی عکاسی کرتا ہے۔

> شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
> دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

یہ بہار کے کلاسیکل ڈراموں میں اہم مقام رکھتا ہے۔

شکست کی آواز طارق جمیلی کا دوسرا مگر اہم ڈراما ہے۔ یہ ڈراما پانچ ایکٹ اور اکہتر ۷۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلے ایکٹ میں چار مناظر ہیں۔ دوسرے ایکٹ میں صرف دو مناظر ہیں۔ تیسرا ایکٹ چار مناظر پر قائم ہے۔ چوتھے ایکٹ میں کل تین مناظر ہیں۔ پانچواں ایکٹ کل چار مناظر پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بہار اردو اکاڈمی پٹنہ کے کے مالی تعاون سے ۱۹۸۴ء میں لیتھو پریس کٹیہار سے شائع ہوئی ہے اس کا سائز ۱۲×۱۳ سم ہے۔ یہ ڈراما بھی اسٹیج ہو چکا ہے۔

غالب پر لکھے گئے ڈراموں میں یہ ڈراما ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

اسکے علاوہ مصنف کا ایک اور ڈراما بنام "انسان" بھی ہے جس کا ذکر مصنف نے اپنی کتاب "شکست کی آواز" کے آخری صفحہ پر کیا ہے۔ لیکن باوجود کوشش کے مجھے اسکا پتہ نہیں مل سکا۔

گوداوری کی گود میں پروفیسر قمر التوحید کا یہ ڈراما رسالہ "پگڈنڈی" امرتسر جلد نمبر ۴ شمارہ نمبر ۱۲ بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ یہ مختصر ڈراما انگریزی زبان کا چربہ ہے۔

ممی کا پنجہ یہ ڈراما بھی پروفیسر قمر التوحید کا ہی لکھا ہوا ہے جو ۱۹۶۰ء میں ٹی۔ این۔ بی کالج بھاگلپور

میں کالج کے طلبا کے ذریعہ اسٹیج پر پیش کیا گیا۔

عید کا دن ریڈیائی ڈرامے میں قمر التوحید کا ڈراما "عید کا دن" کافی مقبول ہوا ۱۹۷۶ء سے لگاتار کئی بار نشر ہو چکا ہے۔

پریم یا بیوپار پروفیسر مظفر اقبال کا یک بابی ڈراما ۱۹۶۰ء میں رسالہ "صنم" پٹنہ بابت ماہ مارچ میں شائع ہوا۔ بہار کے مختصر ڈراموں میں ایک اہم اضافہ ہے۔

استاد شیرو یہ ڈراما مگدھ پریس مصلح پور پٹنہ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے مصنف بدر عظیم آبادی ہیں۔ یہ ڈراما کتابی شکل سے پہلے روزنامہ اخبار "صدائے عام" پٹنہ میں قسط وار شائع ہوا۔ بعد میں یہ ڈراما ۶۲ صفحات پر مشتمل کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس ڈرامے میں ایکٹ کے عوض عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ ہر عنوان میں استاد شیرو ہی کو دکھلایا گیا ہے دراصل یہ ایک ہی ڈراما ہے۔ جو ۸ سین اور ایک ایکٹ پر مشتمل ہے۔ ۱۸×۱۲ س۔م کے سائز پر طبع شدہ ہے۔

خسرو و شیریں سمیع الحق بہار کے اردو ڈراما نگاروں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ڈراما خسرو و شیریں انکی فنکارانہ تخلیق ہے۔ دراصل امیر خسرو کی مشہور فارسی مثنوی خسرو و شیریں کا چربہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۶ء میں پہلی دفعہ عظیم آباد پبلیکیشنز لمیٹیڈ پٹنہ سے ۱۸×۱۲ س۔م کے

سائز میں شائع ہوئی۔ ویسے تو یہ ڈراما چھ ابواب اور ۱۴۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ دراصل یہ ڈراما چار ابواب پر ہی ختم ہو جاتا ہے پہلا باب تمہیدی باب کے عنوان سے ڈرامے میں شامل ہے۔ اور آخری باب ڈرامے میں اختتامیہ کے عنوان سے شامل ہے۔

بھیگی بستی جدید دور یکبابی اور مختصر ڈراموں کا دور رہے سمیع الحق کا یہ ڈراما بہار اُردو دنیا میں ایک اہم اضافہ ہے۔ یہ کل ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ڈراما پانچ صحیفے نامی نصاب کی کتاب میں شامل تھا۔ جو بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک پبلیشنگ کارپوریشن پٹنہ سے شائع ہوئی ہے یہ ڈراما صرف دو مناظر پر مشتمل ہے۔

اس کے علاوہ سمیع الحق نے قدیم یونانی ڈراموں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ جو قابل توجہ ہے۔

شہنشاہ ایڈیپس یہ ڈراما مظہر پبلشرز رانچی سے دی آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ سے طبع ہو کر ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا یہ ۱۰×۱۵ سم کے سائز میں ہے۔

انطی گونی یہ ڈراما بھی منظوم ترجمہ ہے۔ سمیع الحق نے قدیم ڈراموں کے ترجمہ کے ذریعہ بہار کے ڈراموں کی تاریخ میں اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب بہار اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے ۱۹۸۱ء میں دی آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ سے

شائع ہوئی۔ یہ کل ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا سائز ۱۲×۱۳ س۔ م ہے۔

اپڈیپس ارض کولونومیں

سوفوکل اعظم کا یہ یونانی ڈراما ہے۔ جسکا منظوم ترجمہ بحُسن وخوبی سمیع الحق نے کیا ہے۔ اس کا سائز ۱۶×۱۲ اس۔ م ہے۔ یہ کتاب منظہر پبلکیشنز ادبہا تو۔ رانچی (بہار) سے ۱۹۹۵ء میں طبع ہوا۔ یہ کل ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف کا یہ ترجمہ بھی اسقدر دلچسپ اور موثر ہے کہ یہ ترجمہ کی جگہ تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ بہار کا یہ ڈراما قابل توجہ ہے اور ایک بے بہا اضافہ ہے۔

ساگر اور لہریں

ڈراما "ساگر اور لہریں" کے مصنف سید ظہیر احسن ہیں۔ یہ کتاب بہار اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کا سائز ۱۳×۲۱ س م ہے۔ یہ ڈراما پانچ ایکٹ اور ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدائی چار ایکٹوں میں صرف دو سین ہیں اور پانچواں ایکٹ چار سین پر مشتمل ہے۔

دراصل اس ڈرامے کا پلاٹ انگریزی کے ناول نگار تھامس ہارڈی کے مشہور ناول The Mayor of CasterBridge سے ماخوذ ہے۔

دوپہر کے بعد

"دوپہر کے بعد" نامی کتاب شفیع مشہدی کے مختصر ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے اس میں درج ذیل ڈرامے ہیں۔

اجنبی دیواریں، دوسر اکیتھیسز، دوپہر کے بعد، انگلیاں فگار اپنی، پتھروں کا شہر اور مٹھی بھر خاک۔ یہ کتاب بہار اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے مکتبہ ادب گردنی باغ پٹنہ سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی جو ۱۴۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس کے اکثر ڈرامے ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔

خون کی مہندی

یہ کتاب شین مظفر پوری کے مختصر ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں ۱۱ کا نوٹ، انٹرویو کا چکر، سرکس کا شیر، خون کی مہندی، تیسری آنکھ، انوکھی بات اور بےچارہ شاعر پر مشتمل ہے۔ یہ بھی بہار اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے لیتھو پریس رمنہ لین پٹنہ ۴ سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ۱۲×۱۸ اس یم کے سائز پر کل ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کے ڈراموں میں موجودہ سماجی مسائل کو بڑے دلچسپ اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

پردے کے سامنے

"پردے کے سامنے" تمنا مظفر پوری کے مختصر ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب بھی بہار اردو اکاڈمی کے مالی تعاون

سے تاج پریس باری روڈ گیا سے طبع ہو کر اکتوبر ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی ہے اسکا سائز ۱۳×۱۸ اس یم ہے۔ یہ کتاب کل ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں درج ذیل ڈرامے ہیں۔

مجھے انصاف چاہیئے۔ بیگم کا گھریلو بجٹ، قصہ کراسن تیل کا، مجھے پھانسی دیدیں، انٹرویو بورڈ، گرام پنچایت، جہیز کی ریل گاڑی، رحم وستم اور مچھلیوں کی عدالت، یہ تمام ڈرامے مزاحیہ وطنزیہ ہیں اکثر وبیشتر یہ تمام ڈرامے ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ اور اردو کے رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔

ڈرامے "نل دمینتی، بے وطن کی عید، پریم شکتی، ہمایوں انٹیریں فرہاد، گریجویٹ، ہٹلر، آواز، راج گرو، ٹھوکر اور گاؤں کی ایک شام، کا ذکر ڈاکٹر عبد العلیم نامی نے اپنی کتاب میں کیا ہے جس کے مصنف ضیا عظیم آبادی ہیں (افسوس یہ ہے کہ میری نظر سے کوئی بھی ڈرامانہیں گذرا) اس طرح ڈرامے، دیش کی پکار، آنسو، کسان کی بیٹی، انوکھی سہاگن، ہمایوں اور نشانہ کا بھی ذکر عبد العلیم نامی نے کیا ہے۔ ان کے مصنف کا نام عزم بانزید پوری ضلع گیا لکھا ہے۔

ڈرامے "راہ کا دیا، نینا جوگن، شیر شاہ، غلط فہمی، روشنی عید کی ایک شام، ایک ولی پوشیدہ اور ایک کافر کھلا، اور جہاں آرا۔ کے مصنف سہیل عظیم آبادی ہیں۔ ان کے تمام ڈرامے ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ بہار کے ڈراموں میں اہم ہیں

اس کے علاوہ انھوں نے ایک اور ریڈیائی فیچر بہ عنوان "دبستانِ عظیم آباد" تحریر کیا ہے۔

اُجالا باقی ہے

یہ شمیم افزا قمر کا پہلا ریڈیائی ڈراما ہے۔ رسالہ ماہنامہ "آہنگ" گیا، بابت ماہ جنوری ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ یہ چار سین پر مشتمل ہے۔

کتنے رُوپ

یہ مختصر ڈراما بھی شمیم افزا قمر کا تحریر کردہ ہے۔ یہ پانچ ایکٹ پر مشتمل ہے۔ ۱۹۸۵ء میں رسالہ سہ ماہی "توازن"، مالیگاؤں کے شمارہ نمبر ۸ میں شائع ہوا۔ یہ ڈراما سہیل عظیم آبادی کے مشہور ناولٹ "بے جڑ کے پودے" سے متاثر ہے۔

ٹرنکولائزر کی گولیاں

مصنفہ کا تیسرا ڈراما ہے۔ دراصل شمیم افزا قمر نے اپنے مختصر افسانے "زمانہ بدل گیا" کو ڈرامے کے قالب میں ڈھالا ہے۔ پہلی دفعہ یہ ڈراما "رات باقی ہے" کے عنوان سے ریڈیو سے نشر ہوا۔ پھر بعد میں مصنفہ نے اسے "ٹرنکولائزر کی گولیاں" کے نام سے رسالہ سہ ماہی "توازن"، مالیگاؤں سے شائع کرایا۔

دیوانِ غالب

یہ مصنفہ کا اب تک کا آخری ڈراما ہے۔ جو مزاحیہ ہے۔ یہ دو سین پر مشتمل ہے۔ رسالہ ماہنامہ "شگوفہ"، حیدرآباد بابت ماہ

دسمبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔

کلاکار "کلاکار" نامی ڈراما رسالہ ماہنامہ "مریخ" کے شمارہ بابت ماہ نومبر تا جنوری ۱۹۸۷ء، ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے مصنف نوید ہاشمی ہیں۔

ان کے علاوہ ذکی انور کا ڈراما "آگ اور پھول" بہار کے بہترین ڈراموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ عظیم اقبال کا ڈراما "نیا عہد نامہ" اور کوئی وعدہ نہیں، ریڈیو اور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

موجودہ دور میں رحمٰن شاہی کا ڈراما "دیمک" کافی مشہور ہوا۔ سلطان آزاد کے ڈرامے "نکتہ چیں اور قصہ شاعر کا" بھی کئی دفعہ ریڈیو سے نشر ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر محمد قاسم کے ڈرامے "ارادہ، انصاف، انٹرویو اور قصہ ٹیلی ویژن کا" رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس کے علاوہ انجم مانپوری کے افسانہ "میر کلو کی گواہی" افسانہ ہوتے ہوئے بھی ڈرامے کی تمام خاصیت رکھتا ہے۔ وہاب اشرفی، شکیل الرحمٰن، شمیم فاروقی اور شمیم عالم مصحفی، وغیرہ کی ایک لمبی فہرست بہار کے ڈرامانگاروں کی موجود ہے۔
اس کے باوجود بہار کے ادیبوں کو فن ڈرامانگاری کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تاکہ فن ڈراما

بہار میں فروغ پا سکے اور اُردو ادب میں ڈراما نگاری کی ترقی دیگر اصناف ادب کی طرح مستحکم ہو سکے۔

* * *

* * *
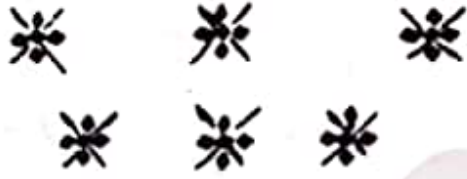
(۴) بہار کے اُردو ڈراموں کی قدر و قیمت

تنقیدی جائزہ

دنیا کے قدیم و جدید مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ ترسیل افکار کا سب سے عمدہ اور مؤثر ذریعہ ڈرامانگاری ہی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ادب کی ابتدا اور آفرینش فن ڈراما سے ہی ہوئی ہے۔ دنیا میں تہذیب و تمدن کی ترقی میں ڈراما بڑا ہی مدد گار ثابت ہوا۔ بڑے انقلابات اسی فن ڈراما کے ذریعہ ظہور میں آئے اور کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ ہر زمانہ میں، اس فن نے عوام کو بیدار کرنے میں معاون اور مؤثر رول ادا کیا ہے۔ مذہبی تعلیم و تبلیغ بھی ڈراما کی ہی رہین منت رہی۔ اور زبان و بیان اور ادب کی ترقی بھی اس کے ذریعہ ہوئی ہے۔ اسی لئے دنیائے ادب میں فن ڈرامانگاری کی بے قدر و قیمت اہم مانی جاتی ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں بہار کے ڈراموں اور ڈراما نگاروں کا اب تک ذکر نہیں ملتا ہے۔ جب کہ موجودہ تحقیقی مقالہ سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اردو میں بہار کے ڈراما نگاروں نے بھی تقریباً اس وقت سے ہی ڈراما لکھنا شروع کیا جب ہندستان کے دوسرے صوبوں کے ڈراما

نگاروں نے لکھنا شروع کیا تھا البتہ اردو کے قدیم ڈراموں کی طرح بہار کے معیاری ڈرامے بھی شروع سے ہی اردو رسم الخط میں نہیں لکھے گئے۔ اور بہت زمانہ تک اردو ڈراما نگاری کے تاریخی ارتقار کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔ اس طرح بہار میں اردو ڈراما نگاری کے ارتقار کی تاریخ گمنامی کے عالم میں رہی۔ جب کہ بہار کے معیاری اور بہترین ڈرامے ارتقائی دور میں ہی لکھے گئے ہیں۔ بہار کے ارتقائی دور کے ڈراموں کو شروع میں ہی اردو رسم الخط میں تحریر کیا جاتا تو یہ یقیناً اس وقت کے ڈراما نگاروں کے لئے مثال بنتے۔ اور پھر بہار ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے ڈراما نگار اس سے مستفید ہوتے۔ اس کے باوجود بہار میں جو بھی ڈرامے لکھے گئے ہیں ان کی قدر و قیمت اردو کے دوسرے اہم ڈراموں سے کہیں بہتر اور معیاری ہے۔

اب تک ہندوستان بھر میں جو ڈرامے لکھے گئے ہیں ان کی حیثیت اکثر یہ ہے کہ ان کے پلاٹ کردار محل وقوع ماورا فوق الفطری اور جادو اور طلسم پر مبنی ہیں اور فن ڈراما نگاری کے اعتبار سے کمزور بھی ہیں۔ اس کے برعکس بہار کے ڈرامے ان برائیوں سے پاک تھیں۔ حقیقت اور واقعیت پر مبنی ہیں اور اپنے زمانہ کے ماحول سے ہم آہنگ ہیں جو اردو ڈراما

نگاری میں منفرد مقام اور سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈراما سجاد سنبل اپنے دور کے اکثر ڈراموں سے متفرق ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس دور کے اکثر ڈراموں کے بالکل برعکس اس کا قصہ واقعاتی ہے۔ اسکے کردار حقیقی دنیا کے کردار ہیں۔ کوئی بھی کردار مافوق الفطری خاصیت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ اس زمانے کے مشہور ڈرامے " اندر سبھا "، " بے نظیر و بدر منیر "، " حاتم طائی "، " گل صنوبر "، " گل بکاولی "، " نقش سلیمانی "، وغیرہ میں مافوق الفطری عناصر پرستانی، طلسماتی، دیو پری، جن رجال الغیب، عفریت وغیرہ ملتے ہیں۔ اور قصے میں مظلوم اور ستم رسیدہ کی مدد کے لیے دیو یا اکثر ڈرامے میں کوئی نہ کوئی پیر و مرشد ہی آکر اس کی مدد کرتے ہیں۔ یا رجال الغیب یکایک نمودار ہوتے ہیں۔ اکثر مصنفین نے انکی ہی مدد سے ڈرامے کو کامیاب بنایا ہے۔ برعکس اسکے، سجاد سنبل کے واقعات اتفاقات پر مبنی ہیں۔ اور ہر جگہ انسان ہی ہونے والے مسائل کو بہ حسن و خوبی طے کرتے ہیں جس سے ڈرامے میں حقیقی زندگی کا عکس نمایاں ہے مثلاً سجاد انقلابی گروہ کے ہاتھوں گرفتار ہوتا ہے اور اسے ایک تہہ خانہ میں بند کر دیا جاتا ہے تو اتفاقیہ طور پر مزاحیہ کردار ہیم چندر چکرورتی اپنی سائنسی مہم کے سلسلے میں تہہ خانے کی کھدائی کرتے وقت سجاد کو دیکھتا ہے اور اس طرح اسے رہائی

ملتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح شمشیر بہادر کے عباس کو مار ڈالنے کی کوشش کرتے وقت محض اتفاق سے کمرے کی کھڑکی کھلی رہ جاتی ہے اور اس کھڑکی سے حلیمہ اندر آتی ہے اور شمشیر بہادر کو کرچ سے زخمی کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ سنبل کی جان بچانے والی بڑھیا بھی اتفاق سے ہی اس راستے سے گذر رہی ہوتی ہے اور اسکی نظر سنبل کی نیم مردہ جان پر پڑتی ہے اور اُسے اپنے گھر لاکر تیمارداری کرتی ہے اور وہ موت کے مُنہ سے بچ جاتی ہے۔

اس طرح سے مصنف نے اپنے پلاٹ کو واقعہ کا اصل رنگ دینے کیلئے محل وقوع اشخاص کی گفتار و کردار ان کے جائے مقام کو اس زمانے کے تمام ماحول سے متاثر ہو کر اس ڈراما میں پیش کیا ہے۔ سجاد سنبل میں پلاٹ کی ترتیب پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس اس زمانے کے تمام ڈرامے ان خامیوں سے بھرے ہیں۔

جب ہم ڈراما سجاد سنبل کے قصے اور اس زمانے کے دوسرے ڈراموں کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ اس زمانے کے اکثر ڈراموں کا عام طور پر یہ حال ہے کہ وہ اپنے قصے کیلئے جائے مقام یا تو پرستان اور طلسمات جیسے خیالی مقامات یا پھر مصر یا چین، یونان یا شام یا وغیرہ دور دراز ممالک یا

پھر سنگلدیپ، زرنگری، فردوس، اِرم اور کوہ قاف وغیرہ جیسی من گھڑت جگہوں کا ہی استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے تمام قصے پر رومانی اور خیالی فضا شروع سے قائم ہو جاتی ہے ۔ اسکے برعکس سجاد سنبل کے واقعات اسی ہندوستان کی سرزمین میں واقع ہوتے ہیں جو عام انسانوں کی بستی ہے اور جس سے ہم سارے لوگ واقف ہیں ۔ جیسے زیادہ تر واقعات بہار شریف اور پٹنہ میں رونما ہوتے ہیں ۔ سجاد حسین اَملیر کا رہنے والا ہے تو سنبل مرداد محلے کی ہے اور شمشیر بہادر بہار خانقاہ کا زمین دار ہے ۔ غرض کہ تمام مقامات جانے پہچانے معلوم ہوتے ہیں ۔ راج محل کا علاقہ اس زمانے میں ہندوستانی آزادی پسندوں کا مسکن تھا اور اس طرح ان کے ڈرامے سجاد سنبل میں ہر چیز حقیقت ہی حقیقت نظر آتی ہے ۔ کردار تو بالکل ہی انسان ہیں ۔ عام دنیا کے لوگوں کی طرح گوشت پوست رکھنے والے انسان ہیں ۔ یہاں تک کہ ان کے تمام نام بھی ہندوستانی ہیں ۔ جیسے سجاد عباس، شمشیر بہادر گھسیٹا بدمعاش، ہیم چندر چکرورتی، سنبل، حلیمہ، شبنم، حسین اور محمودہ وغیرہ ، اس کے برعکس اس زمانے کے دوسرے ڈراموں کو ہم دیکھتے ہیں تو ان کے نام اجنبی اور علامتی معلوم ہوتے ہیں جیسے خود پسند، نیک بہیمن، شمر، بہزاد بخت، وجہ القمر، اظلم، سمن بو، امیر ین امیر

ہامانی، اسفل، پسندیدہ، شمس البقار، وغیرہ۔

سجاد سنبل کی سب سے دلچسپ چیز اس کا مکالمہ ہے البتہ بعض مقام پر طویل گفتگو ضرور ملتی ہے۔ لیکن زیادہ تر مکالمے سیدھے سادے فطری انداز کے ہیں۔ اس زمانے کے زیادہ ڈراموں کے مکالمے مسجع اور مقفیٰ ہیں۔ لیکن سجاد سنبل کے ڈرامے کے مکالمے اس سے پاک ہیں یہاں تک کہ گانے اور اشعار بھی بہت کم ہیں۔ جبکہ اس زمانے کے ڈراموں میں گانے اور گیت کی بے بہتات ہے لیکن سجاد سنبل کے مکالمے اور زبان و بیان اس سے جدا ہیں۔ اس ڈرامے میں ہر شخص کی جدا زبان اور الگ الگ محاورے کردار کی حیثیت کے مطابق استعمال کیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ بہار میں جو زبان عوام استعمال کرتے ہیں اسکو بھی بڑے ہی حسن و خوبی سے اس ڈرامے میں استعمال کیا گیا ہے۔ جس سے ڈراما حقیقت بن گیا ہے۔ اور اس لئے پروفیسر سید حسن نے صحیح لکھا ہے کہ۔

> "میرا خیال ہے کہ بھٹ جی اردو کے پہلے قصہ نگار ہیں جنہوں نے مکالمے میں ہر شخص کی فطری زبان استعمال کی ہے"[1]

غرض کہ سجاد سنبل میں بھٹ جی کا انداز بالکل منفرد ہے جو اس زمانے کے تمام اردو ڈراموں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے

---

[1] بہار کا اردو اسٹیج اور اردو ڈراما۔ پروفیسر سید حسن صفحہ ۹۴۔

حقیقت یہ ہے کہ ابتدا میں یہ ڈراما اردو رسم الخط میں
طبع ہوتا تو یقیناً اردو ڈرامے کی فضا خیالی نہ ہوکر حقیقت سے
قریب ہوتی اور اردو ڈراما نگار اور تنقید نگار اس ڈرامے کو قدر
کی نگاہ سے دیکھتے اور اس سے مستفید ہوتے اس کے باوجود
اب بھی یہی بات صحیح ہے کہ فنی اور ادبی اعتبار سے اردو کا پہلا معیاری
ڈراما ہے اور بہار کو یہ فخر ہے کہ یہ ڈراما یہاں لکھا گیا ہے اس
طرح یہ اپنے عہد کا ایک شاہکار اردو ڈراما ہے۔

شمشاد سوسن، منشی کیشورام بھٹ کا دوسرا اہم ڈراما ہے
جو اب تک اردو دنیا میں ہی نہیں بلکہ ہندی ادب میں بھی
گمنامی کے عالم میں ہے اگرچہ ہندی ادب کے مصنفین اور
تنقید نگاروں نے اسے ہندی ڈراما ضرور قرار دیا ہے۔ لیکن
اسکی افادیت و اہمیت سے اب تک مستفید نہیں ہوسکے
اور اب اسے نایاب کہہ کر گمنامی میں ڈال رکھا ہے۔

प० केशव राम भट्ट के "शमशाद सोसन प्रगति
नाटक प्रवाह में न जाने कहाँ विलीन हो गया।

پنڈت کیشورام بھٹ کا ڈراما "شمشاد سوسن" اصلاحی
ڈراما کی موج گرداب میں نہ جانے کہاں گم ہوگیا[1]

حقیقت یہ ہے کہ یہ سو فیصد اردو ڈراما ہے۔ اور یہ سجاد
سنبل سے بھی زیادہ حقیقت کی عکاسی کرتا ہے اور اس اعتبار

---

[1] بہار کا ساہتیہ پہلا بھاگ (ہندی) صفحہ ۸۵۔

سے اس ڈرامے کا مقابلہ اس عہد کا دوسرا کوئی ڈرامہ نہیں کرتا ساتھ
ہی اس زمانے کے انگریز ظالم حکمراں کے ظلم و زیادتی کی سچی تصویر
کشی کرتا ہے۔ مصنف پر اس زمانہ کے مسلم رہنما سر سید
و حالی کی چلائی ہوئی تحریک کا اثر بھی نمایاں ہے جس کو مصنف
نے اس ڈرامے میں بڑے ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے
اگرچہ اس ڈرامے کا پلاٹ بنگلہ ڈراما "سُر یندر ونودنی" سے ماخوذ
ہے لیکن یہ بنگلہ کا روپانتر نہیں ہے جیسا کہ سجاد سنبل ہے
شمشاد سوسن کا قصہ سماجی نفسیاتی مسئلے پر مبنی ہے جو
اپنے آپ اس ڈرامے کی ایک اہم خاصیت ہے۔ اکثر اس
زمانے کے ڈراموں میں یہ پایا جاتا ہے کہ قصہ خیالی ماحول کی
عکاسی کرتا ہے لیکن شمشاد سوسن میں جو قصہ ہے وہ بڑا
ہی دلچسپ اور حقیقت سے قریب ہوتے ہوئے نصیحت آموز
بھی ہے۔ خاص طور پر مصنف نے کبیر داس اور شیخ سعدیؒ
کے درج ذیل اشعار کے افکار کو اس ڈرامے کے قالب میں
فنکارانہ طور پر ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ع۱ دربل کو نہ ستایو جاکی موٹی ہائے
موئی کھال کی سانس سے سار بھسم ہوئی جائے
کبیر داس

ع۲ اے زبر دست زیر دست آزار
گرم تا کے بماند ایں بازار۔ شیخ سعدیؒ

مصنف کا یہ تخلیقی عمل جس کا اثر وقتی اثر کا حامل نہیں رہا بلکہ اس میں ابدیت پیدا ہو گئی ہے اور جو زمان و مکان سے آزاد ہو کر آفاقی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ آج بھی اسکی اہمیت و افادیت یکساں طور پر برقرار ہے۔ ڈرامے کا پلاٹ سیدھا سادہ ہے۔ یہاں تک کہ اپنے زمانے کے علاوہ مصنف کے دوسرے ڈراما، سجاد سنبل سے بھی سیدھا سادہ مگر بہت ہی مؤثر ہے۔

قصہ گوئی ایک فن ہے۔ کیشو رام بھٹ نے اپنے ڈرامے میں واقعات کو انفرادیت کے ساتھ سیدھے سادے اور فنکارانہ انداز میں ترتیب دے کر ڈرامے کو کامیاب بنایا ہے۔ قصہ رو صاحب مجسٹریٹ کے ظلم کی داستان کے ساتھ شمشاد سوسن کی محبت اور قیصر کی شرارت پر مبنی ہے اور اس زمانے میں ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں پر کس کس انداز میں انگریزوں نے ظلم ڈھایا ہے اس کا پورا پورا عکس اس ڈرامے میں ملتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی زمانے کے حالات و تاریخ کو صحیح طور پر جاننے کیلئے۔ اس زمانے کے ادیبوں کی تخلیقات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس ڈرامے کے مطالعہ سے انگریزوں کے ظلم و زیادتی کی تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اس ڈرامے میں بھی خیر و شر کی قوتوں میں تصادم ہوتا ہے۔ نیک اور شریف انسان برے لوگوں کے ہاتھوں وقتی طور پر آزاروں میں

مبتلا ہوئے ہیں شمشاد سوسن اور حمیدہ نیکی کی علامت ہیں
دوسری طرف بدی کے نمائندے رو صاحب مجسٹریٹ اور دین
ناتھ ہیں ۔ جہاں تک ممکن ہو سکا رو صاحب نے شمشاد اور اس
کی بہن پر ظلم و زیادتی ہی نہیں کی بلکہ اسے ایذا پہنچا کر زندگی کو
ختم کر ڈالنے کی حتی الامکان کوشش بھی کی ۔ شروع میں رو صاحب
کی ظلم و زیادتی کامیاب ہوتی نظر آتی ہے ۔ لیکن آخر میں رو صاحب
اپنے ظلم کی سزا پاتے ہیں ۔ کمزور انسانوں کے ہاتھ ایک بہت ہی
مضبوط اور ظالم حکمراں کی شکست ہوتی ہے ۔ یہاں نہیں
Poetic Justice واضح طور پر ملتی ہے ۔

اسکے علاوہ اس ڈرامے کے پلاٹ میں بھٹ جی نے قومی یکجہتی ،
اور حب الوطنی کے جذبات پر مبنی واقعات کو لیکر ڈرامے کو ترتیب
دیا ہے ۔ اس زمانے میں ہی نہیں بلکہ موجودہ دور و حالات میں بھی
یہ ڈراما ہندوستانی عوام کیلئے مفید اور کارآمد ہے ۔ اتفاقیہ طور
پر اس ڈرامے میں تمام واقعات فطری انداز میں رونما ہوتے ہیں
شمشاد ایک ہمدرد نیک نفس اور محب وطن نوجوان اور انسان
دوست شخص ہے ۔ یہاں تک کہ انگریز رو صاحب مجسٹریٹ کے
بھی اسکی مصیبت میں کام آتا ہے ۔ اور جب رو صاحب شمشاد
سے روپے قرض لیتا ہی نہیں بلکہ اپنی مکارانہ چال اور بداخلاقی کا
پورا پورا ثبوت دیتا ہے ۔ وہ دستاویز کو پھاڑ کر روپے ہڑپ

لیتا اور اسکی بہن پر بری نظر رکھنے کا اظہار بھی کرتا ہے تو شمشاد اس پر غصہ ہوتا ہے ۔ وہ جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتا ہے ۔ جو ایک انسانی فطرت کے مطابق ہے ۔ وہ روصاحب کو مارنے کے لئے ٹوٹ پڑتا ہے ۔ روصاحب اپنا طمنچہ نکال کر شمشاد پر داغ دیتا ہے ۔ شمشاد گر پڑتا ہے ۔ روصاحب اسے مردہ سمجھ کر چل دیتے ہیں ۔ لیکن شمشاد کو اتفاقیہ طور پر گولی سینے میں نہیں لگ کر کاندھے میں لگتی ہے ۔ جس سے وہ زندہ بچ جاتا ہے اور پھر اتفاقیہ طور پر باڑھ اسٹیشن کی پھلواری میں شمشاد وقت گذار رہا ہوتا ہے تو روصاحب بھی پھلواری میں ہوا خوری کیلئے آتے ہیں ۔ رو صاحب شمشاد کو زندہ دیکھکر حیرت زدہ ہوتے ہیں ۔ شمشاد کا ضمیر پھر جوش میں آتا ہے اور روصاحب کا کوڑا چھین کر اسے خوب پیٹتا ہے ۔ روصاحب بڑی مشکل سے جان بچا کر نکل جاتے ہیں اس طرح جتنے بھی واقعات رونما ہوتے ہیں وہ نفسیاتی اور فطری معلوم ہوتے ہیں اور کم و بیش ایسے واقعات اس دنیا میں عام لوگوں کے ساتھ اکثر پیش آتے ہیں ۔ روصاحب جب اپنے ظلم و زیادتی اور ہوس پرستی کو پورا کرنے کیلئے اپنی تمام طاقتوں کا استعمال کرتے ہیں تو اس کے خلاف نہ صرف شمشاد بلکہ حیات بخش کے علاوہ قیصر بھی مقابلے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں ۔ یہ تمام لوگ پہلے تو قانون اور انسانیت کا سہارا لیتے ہیں ۔ لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوتی

ہے۔اور روصاحب مجسٹریٹ شمشاد کی بہن کو ایک رات کے لئے حاجت میں رکھنے کا حکم دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں قیصر بہت ہی بے چین ہو اٹھتا ہے اور وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ حمیدہ کو کسی نہ کسی طرح چھڑا لیا جائے۔ خود حمیدہ اپنی عزت بچانے کے لئے روصاحب سے منت سماجت کرتی ہے۔اور جب کوئی راستہ نظر نہیں آتا ہے تو وہ کمرے سے نکل کر چھت سے کود جاتی ہے۔وہ خون میں لت پت ہو جاتی ہے۔اسکے باوجود روصاحب اپنی ہوس کی آگ بجھانے کیلئے آمادہ رہتے ہیں۔لیکن یہاں بھی اتفاقیہ طور پر زور کا ہنگامہ ہوتا ہے اور دین ناتھ روصاحب کے قریب آکر انہیں خبر دیتا ہے کہ حضور والا تمام قیدیوں نے جیل کو توڑ ڈالا ہے اور آپکی ہی طرف وہ سب آرہے ہیں۔اس پر روصاحب کا دماغ پلٹ جاتا ہے اور پھر حمیدہ کو اسی کمرے میں بند کر کے قیدیوں پر قابو پانے کے لئے جیل کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں اور اس طرح سے قیدیوں کا روصاحب سے آمنے سامنے مقابلہ ہوتا ہے۔چند قیدی مارے بھی جاتے ہیں۔لیکن ساتھ ہی ایک قیدی روصاحب کی کرچ لیکر انہیں گراکر ان کے سینے پر سوار ہو جاتا ہے اور انہیں جہنم میں پہنچا دیتا ہے اس طرح یہ واقعہ بھی اتفاقیہ طور پر انجام پاتا ہے اور حمیدہ کی عزت اور زندگی بچ جاتی ہے۔حمیدہ اور قیصر کی محبت اسی درمیان پروان چڑھتی ہے۔جب وہ روصاحب کے چنگل میں

گرفتار ہوتی تو قیصر ہمہ وقت اسکی جان کی حفاظت میں کوشاں رہتا ہے اور آخر میں حمیدہ کی شادی قیصر سے اور شمشاد کی شادی سوسن سے ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ شمشاد سوسن میں رونما ہونے والے جتنے بھی واقعات ڈراما نگار نے پیش کئے ہیں وہ تمام واقعات اتفاقیہ، فطری اور حقیقت پر مبنی ہیں کہیں بھی خیالی اور تصنع آمیز نظر نہیں آتے اس زمانے میں اس قسم کے خیال پر مبنی ڈراما لکھا جانا اپنے آپ میں ایک اہم کارنامہ ہے۔

اس زمانے کے جتنے دوسرے ڈرامے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ سارے کے سارے مصنوعی اور طلسماتی ماحول پر مبنی ہیں۔ مثلاً اندر سبھا، بے نظیر و بدر منیر۔ حاتم طائی گل صنوبر، گل بکاؤلی، نقش سلیمانی وغیرہ۔ یہاں تک کہ "شمشاد سوسن کے واقعات و پلاٹ خود مصنف کے پہلے ڈرامے، سجاد سنبل سے بھی بہت زیادہ واقعاتی اور حقیقی زندگی سے قریب ہیں اور یہ ڈراما دو دفعہ اسٹیج پر کھیلا جا چکا ہے"[1]

آج بھی اس ڈرامے کو اسٹیج پر کھیلنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی اس ڈرامے کا ایک باب اپنی اپنی جگہ بذات خود مکمل ڈراما کی حیثیت رکھتا ہے۔ شمشاد سوسن کا پلاٹ بر خلاف دیگر ڈراموں کے ڈرامے ایپک (EPic) کے پلاٹ سے ملتا ہے اور نہ صرف اردو میں اسکی حیثیت انفرادی ہے۔ بلکہ یہ دنیا کے بہترین ڈراموں کی فہرست میں شامل

ع۱ے بھارتیہ رنگ منچ کا ویوچناتمک اتہاس مصنفہ اگیات ص ۱۵۵ تا ۱۵۶ ۔ بہار کا ساہتیہ پہلا حصہ ۱۱۹

کیا جاسکتا ہے۔ اپنے زمانے میں یہ ڈراما منفرد تھا ہی لیکن آج بھی اس ڈرامے کی قدر و قیمت اظہر من الشمس ہے۔

کردار کے اعتبار سے بھی شمشاد سوسن اس عہد کے تمام ڈراموں سے منفرد ہے۔ اس ڈرامے کے تمام کردار انسانی کردار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسکے تمام کردار ہمارے بیچ کے رہنے والے ہیں۔ جیسے شمشاد، قیصر، مولوی حیات بخش، حاجی سلطان بیگ، بخشا مجسٹریٹ، روصاحب، دین ناتھ، مہادیو اور چند قیدی وغیرہ مردانہ کردار ہیں تو نسوانی کرداروں میں سوسن اور حمیدہ بھی ہیں عام طور پر دنیا میں نیک اور بد لوگ پائے جاتے ہیں۔ اس ڈرامے میں بھی مصنف نے نیک اور بد کرداروں کو پیش کر کے حقیقی زندگی سے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ یہ اپنے زمانے کے دوسرے ڈراموں کے کرداروں سے بھی منفرد ہیں۔ اکثر اس زمانے کے ڈراموں میں جن پری، دیو اور مافوق الفطری کرداروں کی بھرمار ہے۔ لیکن ڈراما شمشاد سوسن کردار نگاری کے اعتبار سے بھی اپنے زمانے کے دوسرے ڈراموں کے عیبوں سے پاک ہے اس کا مکالمہ دلچسپ اور پُراثر ہے۔ ڈرامے کی کامیابی کیلئے مکالمہ انسان کے کرداروں کے مرتبے کے اعتبار سے ہونا چاہیئے۔ اس لحاظ سے بھی مصنف نے اس ڈرامے میں مکالمے کا استعمال اپنے انفرادی انداز میں کیا ہے۔ جس سے ڈراما بالکل اپنے ہی زمانے میں نہیں بلکہ موجودہ زمانے میں بھی اتنا

ہی دلچسپ اور مؤثر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ڈرامے کا انداز بیاں واسلوب میر امن کی کتاب "باغ و بہار" کی طرح اہمیت رکھتا ہے جہاں اس کے مکالمے سیدھے سادے اور مؤثر ہیں وہاں مصنف نے اردو کے مختلف نئے الفاظ کے استعمال سے اسکی ادبی اہمیت کو اور بھی اہم بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عہد میں اردو کے جتنے بھی ڈرامے لکھے گئے ہیں ان کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمشاد سوسن کا مدِ مقابل کوئی ڈراما نہیں ہے۔ اس ڈرامے میں حدیث وغیرہ کا استعمال اپنے آپ میں ایک انفرادیت کا حامل ہے اس طرح اس عہد کے کسی دوسرے ڈرامے میں ان کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ مصنف نے اپنے مقصد کو کامیاب بنانے کیلئے موقع و محل سے عربی زبان میں لکھی احادیث اور اس کے ترجمے کو استعمال کیا ہے۔ جس سے مکالمہ میں جدت اور انفرادی رنگ پیدا ہو گیا ہے مکالمے کے اعتبار سے بھی یہ ایک مثالی ڈراما کی حیثیت رکھتا ہے

* چند مثالیں ملاحظہ ہوں *

قیصر:۔ ہاں البتہ یہ بات انسانیت کی ہے کہ غلطی مجھ سے ہوئی، تو کیا ہوا، تم بھی۔ بی۔ اے۔ پاس کرنے کے باوجود غلطی کر سکتے ہو۔

اَلْاِنْسَانُ مُرَکَّبٌ مِّنَ الْخَطَاءِ وَالنِّسْیَانِ[1] (الحدیث)

سوسن:۔ (پیار سے) شمشاد بھلا کبھی میں تم سے خفا ہوئی ہوں[2]

---

[1] شمشاد سوسن۔ مصنفہ کیشو رام بھٹ (ہندی) صفحہ ۲۵

جو آج ہونگی۔ شمشاد میں ایک بات کہتی ہوں، رنج نہ ہونا، بھلے آدمی کی بہو بیٹیوں پر بے سمجھے بوجھے فوراً شک کر لینا مناسب نہیں خواہ وہ تعلیم یافتہ ہوں یا جاہل، امیر ہوں یا غریب، ان کے دلوں میں فاسد خیال جلدی آنے نہیں پاتا۔ خدا کہو تو اور رسول کہو تو، ہم عورتوں کیلئے۔ جو کچھ ہے وہ شوہر ہے۔

✻ حضرتؐ نے بھی فرمایا ہے ✻

لَوْ اَمَرْتُ اَحَدًا اَنْ یَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْأَۃَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا مِنْ اَعْظَمِ حَقِّهٖ عَلَيْهَا۔ (ترمذی شریف) [1]

حاجی سلطان بیگ:۔ (پیار سے) بچے، تم لوگوں نے تو انگریزی پڑھی ہے۔ تم لوگوں کو کیا نصیحت کروں۔ صرف یہ حضرتؐ نے فرمایا ہے کہ۔ اِمْرَأَۃٌ تُوُفِّيَتْ وَالزَّوْجُ عَنْهَا رَاضٍ فَهِيَ فِي الْجَنَّةِ " [2]

مصنف نے عربی زبان میں لکھی احادیث کے ساتھ ساتھ ان کے اردو مفہوم کو بھی اپنے مکالمے میں استعمال کیا ہے جو ڈرامے کے کردار کیلئے اپنے مقصد کو ظاہر کرنے میں بہت ہی مفید ثابت ہوئے ہیں۔ ان سے مکالمے میں جدت ہی نہیں پیدا ہوتی ہے بلکہ ڈراما مثالی اہمیت کا حامل بن گیا ہے۔ مکالمے کی خاصیت یہ بھی ہے کہ ڈرامے کے مطالعہ سے اسٹیج کی سی کیفیت کا لطف قاری کو ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے ہر ایک کردار کے

---

[1] شمشاد سوسن۔ مصنفہ کیشو رام بھٹ صفحہ ۱۱۶-۱۱۵
[2] ایضاً صفحہ ۱۲۵

مرتبے اور حیثیت کے مطابق اسکی زبان میں مکالمے کہلوائے ہیں جس سے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ نمایاں ہے۔ مثلاً روصاحب مجسٹریٹ جب اردو بولتے ہیں تو ان کی اردو میں انگریزی پن نمایاں ہے۔ مثال ملاحظہ فرمائیں:۔

"شمشاد:۔ حضور حاضر ہوا۔ حضور کا مزاج شریف۔

"روصاحب:۔ آپکی ڈعا سے جیتا ہے۔ دیکھ تو ہم نے کیسی اچھی ہندوستانی سیکھی ہے۔ گورمنٹ کو چاہیئے کہ مجھے کاس انعام ڈیں۔

"شمشاد:۔ حضور کو جیسی لیاقت ہے ویسی ہی زبان ہے آپکی تعریف سارے شہر کے منھ سنی جاتی ہے۔

"روصاحب:۔ آج آپ کدھر کدم رنجہ فرمایا ہے۔

"شمشاد:۔ وہ.... جو.... قرض.... لئے.... گئے تھے.... اگر سبیدھا सुविधा ہو تو انہیں.........!

روصاحب:۔ ڈٹس، ڈٹس، ڈٹس، نتھنگ بٹ ڈٹس اون آوٹ سائڈ۔

"Thats, thats, thats, nothing but thats on ant side" [1]

اسکے علاوہ بہار کے مسلم گھرانوں میں جو زبان بولی جاتی ہے۔ اسی زبان کو بھٹ نے اس ڈرامے میں بحسن وخوبی استعمال کیا ہے۔ جس سے ڈرامے میں حقیقت کی عکاسی ہوتی ہے۔ مسلم

---

[1] شمشاد سوسن۔ مصنفہ کیشو رام بھٹ صفحہ ۱۵ و ۱۶۔

ہندوستانی عورتوں کی زبان سے جو مکالمے بھٹ نے کہلوائے ہیں
ان سے بالکل فطری مشرقی خاتون کی نمائندگی کا حقیقی نقشہ ابھرتا ہے
ان سے تصنع کا شبہ تک نہیں ہوتا ہے۔ ان پر بنگلہ یا غیر مسلم یا
مغربی عورتوں کی بول چال کا نشان بھی کہیں نہیں ملتا ہے ہر جگہ
اس ڈرامے کی خواتین مشرقی اور سنجیدہ انداز سے گفتگو کرتی ہیں
جس سے ان کے کرداروں میں مشرقی نسوانی وقار اور سنجیدگی
کے ساتھ ساتھ متانت کا پورا عکس جلوہ فگن ہوتا ہے۔

نوکر، قیدی، ماکسان سبھی کے الگ الگ زبان و بیان اس ڈرامے
میں استعمال ہوئے ہیں۔ ہر ایک کے مکالمے سے یہ جانا جا سکتا ہے
کہ وہ کس مرتبہ اور اعتبار کا مالک ہے اور کیا حیثیت رکھتا ہے
عالم کی زبان عالمانہ ہے اور خاص طور پر جب حاجی سلطان بیگ
ڈرامے کے اسٹیج پر آتے ہیں تو اپنے مزاحیہ اندازِ بیان کے ساتھ۔
عالمانہ گفتگو سے جہاں اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے
ہیں وہیں اس ڈرامے کے کرداروں کو ذرا ہچکچاہٹ یا بار محسوس
نہیں ہوتا۔ قارئین ان کے مزاحیہ مکالمے سے بہت ہی لطف
اندوز ہوتے ہیں۔

اس ڈرامے میں صرف چند گانے گیت اور ٹھمری لکھا بھی
استعمال ہوا ہے۔ شروع میں ڈرامے کے مطالعہ سے ایسا معلوم
پڑ رہا تھا کہ اس ڈرامے میں گیت اور غزل کی بہتات ہو گئے

جیسا کہ اس دور کے دوسرے ڈراموں میں ملتا ہے۔ چنانچہ اس ڈرامے کی ابتدا رحالی کی مشہور نظم سے ضرور کی جاتی ہے لیکن مصنف نے بڑے ہی موثر انداز ہیں۔ اور موقع محل سے گیت، غزل اور ٹھمری کا استعمال کیا ہے۔

سوسن اپنے جذبات کو نغموں کے ذریعہ ظاہر کرتی ہے جس سے قارئین پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ وہ سامعین سے ہمدردی شروع سے آخر تک لینے میں کامیاب ہوتی ہے۔ اس ڈرامے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے جابجا مکالموں میں کچھ شعرار کے اشعار کو اپنی زبان میں تبدیل کر کے استعمال کیا ہے۔ جس سے کرداروں کے خیالات کا اظہار صاف طور سے ہوتا ہے۔ لیکن بیان میں بلاغت کی کمی رہ جاتی ہے۔

مثال ملاحظہ ہو

وقیصر :- خیر تو اب سن لو

(۱) ع جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو[1]

(۲) جھگڑا کو تو مدتوں سے ساوات ہو گئی\
گالی کبھی نہ دی تھی سو اب بات ہو گئی

باقی رہا ہمارا کھانا وہ کبھی آج کل\
سن لو گے ایک دن کہ یہ اوقات ہو گئی[2]

غرض یہ کہ اس ڈرامے میں جہاں پلاٹ، کردار اور مکالمے

---

[1] شمشاد سوسن (ہندی) صفحہ ۱۹۔ [2] شمشاد سوسن (ہندی) صفحہ ۲۵۔

حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں وہیں انہوں نے جو واقعات مقام پر رونما ہوتے ہوئے دکھائے وہ سبھی اپنے زمانے کے تمام ڈراموں سے الگ ہیں اور جس جس جگہ یا مقام کا ذکر ہے وہ بہار کے شہر اور گاؤں ہی کا ہے۔ مثلاً باڑھ، باڑھ کا اسٹیشن، گنگا کے کنارے کا پرانا مکان، باڑھ کا جیل خانہ، پٹنہ شہر وغیرہ۔

اس طرح یہ ڈراما اپنے زمانے کا ہی شاہکار نہیں ہے بلکہ جدید دور کا بھی اہم کارنامہ ہے۔ اور اب تک اردو ڈراموں میں ایک شاہکار ڈراما کی حیثیت رکھتا ہے اگر شروع ہی میں یہ ڈراما ہندی (دیوناگری) رسم الخط میں شائع نہ ہوکر اردو رسم الخط میں طبع ہوکر منظر عام پر آتا تو یقیناً اردو داں عوام اور اردو ڈراما نگار اس سے نہ صرف مستفید ہی ہوتے بلکہ اس سے متاثر ہوکر اس قسم کے دوسرے اہم ڈرامے لکھے جاتے اور اردو ڈرامے کی تاریخ یقیناً مستحکم ہوتی اور دوسرے اصناف کی طرح جامع بھی ہوتی۔

پھر دس سال کے بعد بہار میں ایک ڈراما "جواں بخت و شمس النہار" اردو رسم الخط میں لکھا گیا۔ غالباً درمیانی دور میں بہار کی اردو ڈرامہ نگاری میں جمود کی وجہ اردو رسم الخط میں ڈراما نہیں پایا جاتا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں ڈراما "جواں بخت و شمس النہار" مولوی سید محمد ثواب نے تحریر کیا۔ گوکہ یہ مثنوی "زہر عشق" کا چربہ ہے لیکن اسکے باوجود ایک اصلاحی ڈراما ہے۔ اسکی اہمیت اس لئے بھی ہے

کہ یہ بہار کا پہلا منظوم ڈراما ہے۔ جس میں مصنف نے قصے کو بڑے ہی شاعرانہ انداز میں ترتیب دیا ہے۔ اس سے ڈراما میں حقیقت نگاری کی جھلک نمایاں ہے۔

قصہ جواں بخت اور شمس النہار کی محبت پر مبنی ہے ابتدار میں دونوں ایک دوسرے کی محبت میں بے چین رہتے ہیں اور ہر ممکن طور پر دونوں ایک دوسرے سے مل کر اپنی محبت کو کامیاب بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ لیکن زمانے نے انکی محبت کو کامیاب نہیں ہونے دیا اور دونوں کو محبت میں قربان ہونے پر مجبور کیا۔ قصہ کسی حد تک دلچسپ ہے سیدھے سادے انداز میں بیان کیا گیا ہے کچھ دیر کے لئے شمس النہار بچھڑ جاتی ہے اسکے والدین جھوٹی خبر دیتے ہیں کہ جواں بخت کو غداری کے جرم میں پھانسی کی سزا دی جا چکی ہے شمس النہار کو جواں بخت کی محبت پر پورا اعتماد اور بھروسہ ہے پہلے وہ اس پر یقین نہیں کرتی اور تصدیق کرنے کے لئے ایک شخص کو بھیجتی ہے لیکن راستے میں ہی وہ وبائی مرض ہیضہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ کافی انتظار کے بعد بالآخر خودکشی کر لیتی ہے۔ اور جب جواں بخت کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکی محبوبہ دوسرے شہر جا چکی ہے تو وہ اسے ڈھونڈنے کیلئے وہاں تک پہنچ جاتا ہے پہنچنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو کب کی اسکی محبت میں دنیا سے رخصت ہو چکی ہے تب وہ اسکی قبر پر جاکر ایک چھرے سے اپنے آپ کو ختم کر لیتا ہے اس

طرح سے یہ ڈراما المیہ طور پر ختم ہوتا ہے۔ اس ڈرامے کی خاصیت
یہ ہے کہ یہ منظوم ہوتے ہوئے بھی بہار تھیٹریکل کمپنی نے اسے اسٹیج
کیا ہے۔ اپنے زمانے میں بہت مقبول بھی ہوا اور لوگ اس اِصلاحی
مقصد سے مستفید بھی ہوئے۔

اس ڈرامے میں کردار بہت کم ہیں لیکن وہ سارے کردار اس
دنیا کے انسان ہیں۔ یہ ڈراما جن پری اور طلسماتی کرداروں سے مبرا اور
پاک ہے جہاں پلاٹ میں فطری انداز ہے وہیں کردار نگاری میں بھی
حقیقت پن ہے۔ اس زمانے کے مسلم گھرانے میں عشق اور محبت کو جس
طرح بُرا سمجھا جاتا تھا اسی طرح اِس ڈرامے میں اس کا انجام بھی
مصنف نے المیہ دِکھایا ہے۔ جس سے قارئین پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے
اردو کے روایتی ڈراموں سے ہٹ کر اس ڈرامے کے واقعات
بھی منفرد ہیں۔ کیونکہ جتنے واقعات رونما ہوتے ہیں وہ سب
ہندوستانی زمیں سے وابستہ ہیں۔ لکھنؤ شہر میں جواں بخت
اور شمس النہار کی محبت کا آغاز ہوتا ہے اور بنارس شہر میں انجام
ہوتا ہے۔ دو پیار اور محبت کرنے والے بنارس کے قبرستان میں اُبدی
نیند سو رہے ہیں اس لحاظ سے اس ڈرامے کی اہمیت دیگر اردو
ڈراموں سے ممتاز ہے اور فنی اعتبار سے یہ ایک کامیاب ڈراما ہے
اب تک کی تحقیق کے مطابق بہار میں ناٹک "جواں بخت
شمس النہار کے 9 سال بعد" ناٹک "محسن" نامی ڈراما

لکھا گیا جس کے مصنف خواجہ محسن علی مونگیری ہیں۔ یہ ڈراما اسٹیج پر بھی پیش کیا جاچکا ہے۔ اپنے زمانے میں یہ کافی مقبول ہوا۔ پلاٹ میں پیچیدگی نہیں ہے لیکن اسکے باوجود واقعات غیر معمولی ہونے کی وجہ سے یہ ڈراما کسی حد تک اہم ہے۔ ڈرامے کا جائے وقوع ہندوستان ہی ہے۔ کرداروں میں بھی ہندوستانی نام اور راجہ مہاراجہ کو دکھایا گیا ہے جسکی وجہ سے ہندوستانی تہذیب ابھرتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی زمانے میں ایسے کردار جو حقیقت میں ہوتے تھے ان کو مصنف نے بڑے ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ ہندوستانی معاشرہ میں نجومی کی اہمیت ہندوستانی تہذیب کی ابتدا سے ہی ہے اور ڈرامے میں بھی ہیرو اپنے خواب کی تعبیر علم نجوم سے معلوم کرتا ہے اور پھر اسکو عمل میں لانے کیلئے مختلف مشکلات سے دوچار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ہیرو ویرم چند اپنی محبت اور عشق کی کامیابی پر اپنی بادشاہت کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لیتا ہے۔ اسکی محبوبہ پدمنی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بڑی حسین اور وفادار ہندوستانی بیوی ثابت ہوتی ہے وہ راجہ کے ساتھ جنگل جنگل خاک چھانتی ہے اور ایک دن اسے ایک چور اٹھالے جاتا ہے۔ اور وہ بادشاہ فیروز شاہ کی گرفت میں آجاتی ہے۔ فیروز شاہ اسکی خوبصورتی سے متاثر ہوکر ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ پدمنی کو اپنا لے لیکن وہ تیار نہیں

ہوتی ہے۔ وہ ہندوستانی عورت کا مثالی کردار بن کر ابھرتی ہے
راجہ مہندر سنگھ اور پریم چند کی مداخلت سے پدمنی کو آخر کار
رہائی ملتی ہے۔ اور یہ ڈراما طربیہ انداز میں ختم ہوتا ہے۔ بہر کیف
"ناٹک محسن"، مجموعی طور سے اپنے دور کا ایک معیاری ڈراما ہے۔ اور
اردو ڈراموں میں اہمیت کا حامل ہے۔

بہار کے ڈراموں میں "گلشن ہیبت شگوفہ حسرت"، اپنے زمانے
کا ایک منفرد ڈراما ہے۔ اسکے مصنف ہری ہر پرشاد لال بابو حضرت
دیہاتی حسرت دیہاتی ہیں اس کا قصہ ظریفانہ اور دلچسپ ہے اس کا
پلاٹ مختصر طور پر یہ ہے کہ ڈبل بیگ نامی نواب زمرد جان نامی
طوائف سے صرف محبت ہی نہیں کرتا بلکہ اسکی جوانی اور خوبصورتی
پر اپنا تمام اثاثہ لٹا دیتا ہے اس سے اس قدر قریب ہو جاتا ہے کہ
اسے کسی دوسرے مرد کے ساتھ دیکھنا نہیں چاہتا ہے اس پر اسے
مارنے کیلئے دھمکاتا ہے۔ لیکن طوائف کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ اسے دوسرے
مرد سے تعلق رکھنے پر مجبور ہونا ہی پڑتا ہے وہ نواب ڈبل بیگ سے
ڈر جاتی ہے۔ اس سے بچنے کیلئے ایک دوسرے رئیس سے مدد لیتی ہے
اور پھر عدالت میں اس پر مقدمہ دائر کر دیتی ہے عدالت اسے جرم
کا مرتکب قرار دیتی ہے مثلاً۔ زمرد جان تاپھا (طوائف) نالس کیا۔ نواب
ڈبل بیگ ناک کاٹنے کو دھمکاتا ہے۔ کورٹ نواب صاحب سے سپھائی
(صفائی) مانگا۔ نواب صاحب سپھائی سے اپنا چال چلن ثابت نہیں

کر سکے۔ اس واسطے کورٹ کو شک ہوتا ہے کہ مدالیہ کھراب آدمی ہے مدعیہ گریب چھیلی کو جلم سے بچانے کو عدالت کارلیے ہے کہ نواب صاحب تین مہینا کے واسطے اپنا چال چلن ٹھیک رکھنے کو جامنتی مچلکا دے۔ (اور اسے چال چلن ٹھیک رکھنے کیلئے عارضی طور پر ضمانت دیتا ہے) ڈراما کا انجام نواب ڈبل بیگ کیلئے المیہ اور زمرد کیلئے طربیہ ہوتا ہے۔

اس طرح مصنف نے ڈرامے کو فنکارانہ طور پر ترتیب دیا ہے یہ ڈرامے کی ایک قسم فارس (Farce) کے زمرے میں آتا ہے جیساکہ مصنف نے اپنے اس ڈرامے کے صفحہ اول پر خود فارس تحریر کیا ہے۔ دراصل انگریزی میں سوانگ کو (Farce) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ لاطینی (Farce) سے نکلا ہے۔ فارس یا سوانگ اس نوع کا ڈراما ہوتا ہے جس میں ادنیٰ مذاق اور مبالغہ آمیز بزلہ سنجی سے ظرافت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ تین ابواب اور کئی پردوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بہار کا یہ پہلا ڈراما ہے جو فن فارس پر پورا اترتا ہے۔ مصنف نے اس ڈرامے کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں ظریفانہ اور مزاحیہ پلاٹ کے ساتھ ساتھ کرداروں کو بھی دلچسپ بنایا ہے۔ اسکے علاوہ اس ڈرامے میں جہاں ظریفانہ انداز بیان سے پلاٹ کو ترتیب دیا ہے۔ وہیں مصنف نے اسکے اصلاحی پہلو کو بھی خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے

قصے کے اعتبار سے یہ انسانی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے
بہار میں ۱۸۹۶ء میں لکھے گئے ڈرامے کھیل طلسمات تقدیر عرف
بہرام گور، سے زیادہ کامیاب اور حقیقت سے قریب ہے مصنوعی
وخیالی پلاٹ وکردار کے برعکس یہ ڈراما حقیقی زندگی کی عکاسی
کرتا ہے۔ پلاٹ نگاری کے اعتبار سے یہ ڈراما مکمل ہے اور بہلد
کا انوکھا ڈراما ہے جو دلچسپی سے بھرپور ہے۔

کرداروں میں مرکزی اور ضمنی دونوں قسم کے کردار اس ڈرامے
میں موجود ہیں۔ مرکزی کرداروں میں زمرد جان نواب ڈبل بیگ
آتے ہیں۔ اس ڈرامے کی ہیروئن زمرد جان ہے اور ویلین کے
روپ میں نواب ڈبل بیگ آتے ہیں اس کے علاوہ ضمنی کرداروں
میں رئیس صاحب (وکیل) مختار، حاکم، من موہن گھوش
پانیشکار مہاجن پنو طبلچی چھوٹے میاں اور بڑے میاں ان
کے علاوہ چپراسی نوکر رمضان میاں وغیرہ اپنی اپنی جگہ پر کامیاب
ہیں۔

مصنف نے اس ڈرامے کے تمام کرداروں کو مزاحیہ وظریفانہ
رنگ میں پیش کیا ہے یہاں تک کہ حاکم عدالت بھی مزاحیہ وظریفانہ
لباس میں نظر آتے ہیں۔ جب زمرد جان کٹہرے میں کھڑی ہوتی
ہے تو حاکم اس سے جو سوال کرتے ہیں وہ اپنے آپ میں جہاں حقیقت
کی عکاسی کرتا ہے وہیں اسکے ظریفانہ رنگ میں طنز بھی چھپا ہوتا

ہے مثلاً !۔

حاکم :۔ (مدعیہ کو دیکھکر منہ پھیر کے) آئے ہائے ! چھیلی تو بڑھ بجالو! آچھے (مدعیہ سے) تمرا نام؟

زمرد جان :۔ حضور اس لونڈی کو لوگ زمرد جان کہتے ہیں۔

حاکم :۔ (منہ پھیر کر آہستہ سے) نام تو بڑو مجے دار (بلند آواز سے) تومرا باپ کا نام؟

زمرد جان :۔ مجکو تو اس کی خبر نہیں اماں جان جانیں۔ (حاکم مسکراتا ہے)

حاکم :۔ تو مرا عمر؟

زمرد جان :۔ بارہ ختم ہوا ہے، تیرہواں شروع ہے۔

حاکم :۔ (چلاکر) بائی جوب! ایکسٹرا آرڈنری!!

(مدعیہ) تومرا موکام؟

زمرد :۔ جس کے پاس جائیں وہیں۔

حاکم :۔ (ہنس کر) تومرا پیشہ؟

زمرد :۔ (ہنس کر) حضور تو سب جانتے ہیں پھر مجھ سے کیوں کہلواتے ہیں۔

حاکم :۔ (ڈپٹ کر) نہیں نہیں تم کو بولنا ہوگا۔

زمرد جان :۔ (شرماکر آنکھیں نیچی کر لیتی ہے اور دبی زبان سے کہتی ہے) ناچنا، گانا، لبھانا، رجھانا، لگانا، بجھانا، ہنسانا، اور کل پیشوں کا باپ داد۔ خ خ خ خ ع چ چ چیپی

کمانا ! ! ع۱

اس طرح جہاں پلاٹ ظریفانہ اور دلچسپ رنگ لئے ہوئے ہے وہیں اس ڈرامے میں مصنف نے تمام کرداروں کو ظریفانہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ جس سے ڈراما دلکش و دلچسپ اور رومان انگیز بن گیا ہے۔ اور اس طرح تمام کردار اپنی اپنی جگہ کامیاب اور مؤثر ہیں۔

گلشن ہیبت شگوفہ حسرت کا سب سے دلچسپ عنصر اس کا مکالمہ ہے۔ مصنف نے اس ڈرامے کے شروع میں نثری مکالموں کا استعمال کیا ہے۔ جو ظریفانہ رنگ لئے ہوئے ہیں۔ اور ڈرامے کی کامیابی میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس زمانے کے مطابق ڈراما نگار نے اس ڈرامے میں منظوم مکالمے بھی استعمال کئے ہیں۔ چونکہ ڈراما نگار شاعر بھی ہے اس لئے جسقدر بھی گیتوں، غزلوں اور ٹھمریوں کو اس ڈرامے میں پیش کیا ہے وہ سب مصنف ہی کی تخلیق ہیں اور انفرادی رنگ لئے ہیں۔ جو ڈرامے کی دلچسپی و رعنائی میں اضافہ کرتی ہیں جو مکالمے نثر میں استعمال ہوئے ہیں وہ بھی بہت ہی عمدہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں ہیں جن کی ادائیگی میں کرداروں کو کوئی دشواری پیش نہیں آتی ہے۔ جو منظوم مکالمے ہیں وہ بھی دلکشی اور رعنائی سے بھرپور ہیں اور ڈرامے میں دلچسپی کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ یہ ڈراما اپنے زمانے میں اسٹیج بھی ہوا ہو گا اور آج بھی اسے اسٹیج پر پیش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ ہر ایک کردار کے مرتبہ اور

ع۱ گلشن ہیبت شگوفہ حسرت۔ مصنفہ حضرت دیہاتی صفحہ ۲۰-۱۹۔

حیثیت کے مطابق مصنف نے مکالمے اسکی زبان سے کہلوائے ہیں
رئیس، حاکم، چپراسی، نوکر، مہاجن اور گواہان کے مکالمے سے انکو جانا جاسکتا
ہے کہ وہ کس حیثیت اور مرتبہ کے کردار ہیں۔ اسکے علاوہ اس زمانے
میں عوام جو زبان بولتے تھے اس کا بھی اس ڈرامے کے مطالعہ سے علم
ہوتا ہے۔ اس زمانے میں طوائف کے یہاں جانا آنا برا سمجھا جاتا تھا
اس کا بھی اندازہ بخوبی ہوتا ہے اور آج بھی اس عمل کو ہمارا سماج پسند
نہیں کرتا ہے البتہ آج کی اردو زبان اور اس زمانے میں بولی اور
لکھی جانے والی اردو زبان میں نمایاں فرق ہے۔ اسکے باوجود گلشن
ہیبت، شگوفہ حسرت، بہار کے ڈراموں کی تاریخ میں اہم اضافہ
ہے اور فنی اعتبار سے اسکی قدر و قیمت آج بھی برقرار ہے۔

ڈراما، کھیل طلسمات تقدیر عرف بہرام گور، بہار کا ایک
اہم ڈراما اسلئے ہیکہ اس ڈرامے میں بیک وقت دو پلاٹ کا استعمال
ہوا ہے اس طرح کے پلاٹ صرف آغا حشر کے چند ڈراموں میں ملتے
ہیں۔ یہ ایک جدت ہے اور اس حیثیت سے اس ڈرامے کی
اہمیت اردو ادب میں دو بالا ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس
ڈرامے کو اسٹیج پر بھی کھیلا گیا ہے۔ پلاٹ بڑا ہی دلچسپ ہے۔ پہلا
پلاٹ ایک سنجیدہ قصے پر مبنی ہے۔ دوسرا تفریحی اور ظریفانہ ہے
اس ڈرامے کے ہیرو بھی دو ہیں اور ہیروئن بھی دو۔ البتہ ہیرو
کے کرداروں کے نام انسانوں جیسے نہیں معلوم ہوتے ہیں۔

نسوانی کردار تو بالکل ہی مافوق الفطری ہے۔ اس ڈرامے میں نظم ونثر
دونوں میں مکالمے استعمال کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی اس زمانے کے
مطابق غزل، ٹھمری اور انترا کا بھی استعمال زیادہ ہے۔ اسکے علاوہ
زبان وبیان کی غلطیاں کثرت سے ہیں۔ اسکے باوجود یہ ڈراما
بہار کے ڈراموں میں اہم مانا جاتا ہے۔

جدید دور میں جہاں دوسرے صوبوں میں ڈرامے لکھے گئے
ہیں وہیں بہار کے ڈرامانگاروں نے بھی مختلف موضوعات پر مختلف
ڈرامے لکھے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر اختر اورینوی کا نام قابل قدر ہے۔ انہوں
نے صرف دو ہی ڈرامے لکھے ہیں جو بہار کے اردو ڈراموں میں سنگ
میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اردو کے معیاری ڈراموں کی تاریخ
میں اضافہ ہیں۔ شہنشاہ حبشہ، بہار کا پہلا جنگی ماحول پر مبنی
ڈراما ہے۔ جس میں ۱۹۳۵ء کی تاریخی جنگ حبشہ کی تباہی وبربادی
سے متعلق قصہ بیان کیا گیا ہے مسولینی کے ظلم وزیادتی اور لیگ
آف نیشنیز (League of Nations) کے بے اثر ادارہ کو بڑے
ہی خوبصورت انداز میں اس ڈرامے میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے
میں خون خرابے سے بچنے کیلئے بادشاہ بڑی ہی بہادرانہ اور باوقار طور
پر شکست قبول کرتا ہے۔ مصنف اختر اورینوی نے تاریخی
واقعات کو بڑے ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ جس سے
شروع سے آخر تک ڈراما میں دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

مصنف نے روایت کے مطابق مرکزی اور ضمنی دونوں قسم کے کرداروں کو اس ڈرامے میں پیش کیا ہے۔ مرکزی کردار کی حیثیت سے ملک حلبشہ کا شہنشاہ اور اطالیہ کے آمر مسولینی مثالی کردار ڈرامے میں بن کر ابھرتے ہیں۔ شہنشاہ حلبشہ اس ڈرامے کا ہیرو ہے۔ وہ شرافت اور انسانیت کا پیکر ہے مسولینی نے اس ڈرامے میں ویلن کا رول ادا کیا ہے۔ وہ ایک مغرور اور ظالم حکمراں ہے مصنف نے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں مسولینی کی آمریت کا تجزیہ کیا ہے اسکے علاوہ ضمنی کرداروں کے تمام افراد بھی اپنی اپنی جگہ انفرادی کردار ہیں۔

اس ڈرامے کی قدر و قیمت کا اصل سبب اور اس کا سب سے دلچسپ اور پُر اثر پہلو کرداروں کے مکالمے ہیں۔ مصنف نے کردار اور ماحول کے مطابق اس ڈرامے میں مکالمے کا استعمال کیا ہے۔ جس سے ڈرامہ میں شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے اور قارئین کو اس ڈرامے کے پڑھنے میں ہی دیکھنے کا لطف ملتا ہے۔

ڈرامہ شہنشاہ حلبشہ پر اعتراض کیا جاسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اسے اسٹیج پر پیش کرنا ناممکن ہے۔ اسکے باوجود اسکی ادبی اہمیت میں کوئی کمزوری نظر نہیں آتی۔ یہ حقیقتاً ایک ادبی ڈرامہ ہے۔ مصنف نے اسکے ادبی معیار کو برقرار رکھا ہے۔ اس ڈرامے کی حیثیت امتیاز علی تاج کے ڈرامے "انارکلی" اور پروفیسر مجیب

کے ڈراما، خانہ جنگی" کی طرح ہے۔ یہ ہمارے نیم تاریخی ڈراموں میں ایک کامیاب ڈراما ہے۔

ڈراما" زوال کینٹن" اختر اورینوی کا دوسرا اور پہلا یک بابی ڈراما ہے۔ یہ بہار کے ارتقائی دور کے یک بابی ڈراموں میں ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ پلاٹ کے لحاظ سے مصنف کا یہ ڈراما بڑا ہی دلچسپ ہے۔ یہ تاریخی نوعیت کا ہے جس میں چین اور جاپان کی جنگ پر مبنی قصہ ہے۔ اس ڈرامے میں مصنف نے گاندھی جی کے اصولِ اہنسا پر طنز ہی نہیں کیا ہے بلکہ گاندھی جی کے فلسفۂ اہنسا پر بھرپور تنقید کی ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ اس پر عمل کرنا آج کی دنیا میں ناممکن ہے۔ الغرض یہ اصول مصنف کی نظر میں ناقص اور ناقابلِ عمل ہے۔ قصے میں شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ کرداروں کا استعمال بڑے ہی فنکارانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ کردار قدرے کم ہیں۔ مرکزی کرداروں میں فاہیان اور اسکی محبوبہ ہے یہ ہیرو اور ہیروئن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں کا انجام المیہ ہوتا ہے۔ مصنف دونوں کرداروں میں انفرادیت قائم کرنے میں کامیاب ہے ضمنی کردار بھی اپنی اپنی جگہ کامیاب ہیں۔ دراصل اس ڈرامے میں حب الوطنی کے جذبات کو کرداروں کے ذریعہ دکھایا گیا ہے۔

مکالمے کا استعمال بھی مصنف نے بحسن و خوبی کیا ہے

مکالمے موقع محل کے اعتبار سے کامیاب ہیں۔ کرداروں کی زبان سے جو جملے استعمال کرائے گئے ہیں وہ فصیح اور سلیس ہیں۔ جملے مختصر اور پُر اثر ہیں۔ عبارت میں روانی اور برجستگی ہے۔ مکالمے کے ذریعہ کردار کی سیرت پر پوری روشنی پڑتی ہے۔

زوال کینڈمنٹ کو اسٹیج پر پیش کرنا آسان ہے۔ فن ڈراما نگاری کے اعتبار سے یہ ڈراما کامیاب ہے۔

بہار کے یک بابی ڈراموں میں پروفیسر منظر اقبال صاحب کا ڈراما "پریم یا بیوپار" بھی بعض اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے یہ ایک مسائلی ڈراما (Prob Lam play) ہے جس میں جہیز کی لعنت کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ دراصل ان نوجوانوں پر ایک طنز ہے جو جہیز کی خاطر اپنی محبت کو قربان کر دیتے ہیں۔

یہ تعمیر ماجرا اور کردار نگاری کے اعتبار سے ایک کامیاب ڈراما ہے اسکے مکالمے بھی دلچسپ اور درست ہیں جن سے کرداروں کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اسکے علاوہ اسے اسٹیج پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

موجودہ دور ریڈیائی اور ٹیلی ویژن ڈراموں کا دور ہے لیکن اسکے باوجود ڈاکٹر طارق جمیلی نے اسٹیج کیلئے ڈرامے ہی نہیں لکھے بلکہ انھیں کامیابی کے ساتھ اسٹیج پر پیش بھی کیا ان کے ڈراموں میں "آگ اور پانی" پہلا ڈراما ہوتے ہوئے بھی فنی اعتبار سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ یہ ڈراما چین اور ہندوستان کی جنگ پر مبنی بہار کا اہم ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں فنکارانہ طور پر کرداروں کو انفرادی انداز میں پیش کیا گیا ہے اس ڈرامے کے کرداروں کی خاصیت یہ ہے کہ وہ سبھی علامتی کردار ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس ڈرامے کے مطالعہ سے پہلے ہی قارئین کو صرف کردار کے نام پڑھ کر ہی ڈراما کے پورے ماحول، کردار اور پلاٹ کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس ڈرامے کے قصے میں جنگ ظلم و زیادتی اور قتل و غارت گری کے ہیبت ناک ماحول کو فرشتہ امن اپنے سنجیدہ ذہن سے خوشگوار بنانے میں کامیاب ہوتا ہے

کردار کے اعتبار سے جنگ اعظم، جنون جنگ، فریب عالم ہمالیہ اور چیند درباری اہمیت رکھتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے ڈراما قابل توجہ ہی نہیں بلکہ علامتی رنگ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ڈرامے میں مکالمہ بڑا ہی موثر ہے مکالمے کو دلچسپ اور پُر اثر بنانے کیلئے مصنف نے اقبال کے اشعار کا موقع محل سے استعمال کیا ہے۔ جو بہت حد تک کامیاب

ہیں ڈرامے کا مرکزی پلاٹ اس شعر پر مرکوز ہے ؂

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے
اقبال

حقیقت یہ ہے کہ آگ اور پانی قدیم روایتی، سنسکرت اور کلاسیکی ڈرامے کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ یہ بہار کے ڈراموں میں ہی نہیں بلکہ اردو کے ڈراموں میں ایک اہم ڈراما ہے جو ہمارے علامتی ڈراموں میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈراما "شکست کی آواز" غالب پر لکھے جانے والے ڈراموں میں طارق جمیلی کا سب سے بہترین ڈراما ہے اسٹیج پر پیش کیا گیا اور کافی مقبول بھی ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنف نے غالب کی زندگی اور انکی محبت کے قصے میں شاعرانہ تخیل سے جدت پیدا کی ہے۔ یہ بات تو عام طور سے عیاں ہے کہ مرزا غالب نے اپنی زندگی میں اپنی بیگم کے علاوہ دوسری عورتوں سے بھی عشق کیا ہے جس کا اشارہ ان کے مختلف اشعار میں جا بجا ملتا ہے لیکن اس ڈرامے میں مصنف نے ترک بیگم کا تعلق غالب سے پہلی دفعہ پیش کیا ہے۔ اس طرح سے غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے ترک بیگم کا کردار ایک تحقیقی سوال بن کر ابھرتا ہے۔ اسکے باوجود قصہ بڑا ہی دلچسپ اور بہت ہی رومان انگیز ہے۔ دلی کی رہنے والی ترک بیگم اپنی غزل کی اصلاح کے ذریعہ غالب کے قریب

آتی ہے اور اسکی شاعرانہ صلاحیت اور ادبی ذوق نے غالب
کو اس سے قریب ہونے پر مجبور کیا۔ ترک بیگم اپنی خودداری
اور دنیا کے ڈر سے اپنی محبت کو ہر طرح چھپانے کی کوشش کرتی
ہے اور ایک دن ایک فرضی خط غالب کے نام لکھ دیتی ہے
جس میں خودکشی کرنے کا ذکر کرتی ہے اور لکھنو چلی جاتی ہے
لکھنو جب فرنگیوں کے ہاتھوں تباہ ہونے لگتا ہے تو ترک
بیگم پھر دلّی چلی آتی ہے اور ایک دن اسکی ملازمہ سے راہ
چلتے غالب کی ملاقات ہوتی ہے۔ اس طرح فرضی خودکشی کا راز
غالب پر افشا ہوتا ہے۔ غالب ترک بیگم کے محل جاتے ہیں
اور اسے اپنی صحت پر دھیان رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے دیوان
کو مرتب کرنے کیلئے کہتے ہیں، وہ تیار بھی ہو جاتی ہے اور دیوان بھی
مرتب کر لیتی ہے کہ یکایک فرنگیوں کا حملہ دہلی پر بھی ہوتا ہے اور
ترک بیگم کے محل میں فرنگی داخل ہوتے ہیں۔ ترک بیگم بڑی بہادری
سے اپنی ملازمہ کو بچانے کیلئے کئی فرنگیوں کو موت کے گھاٹ اتارتی
ہے لیکن ایک فرنگی چپکے سے اس پر گولی چلا کر زخمی کر دیتا ہے پھر
فرنگی میز پر رکھے ہوئے قلمی دیوان کو برباد کر دیتا ہے جسے ترک بیگم
برداشت نہ کر پاتی ہے۔ اور موت سے جا ملتی ہے۔ اس طرح۔
ڈراما المیہ انداز میں اختتام پذیر ہوتا ہے اور اسٹیج پر یہ شعر
گونج اٹھتا ہے۔ ؎

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز   غالب

قصہ اور پلاٹ کے لحاظ سے غالب کی زندگی پر لکھا ہوا یہ ڈراما انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر سید حسن نے اس ڈرامے اور ڈرامے کے مصنف کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ بہت حد تک صحیح ہے

غالب کی شخصیت اور شاعری کی دید و دریافت میں آپ کی یہ کاوش لائق صد ستائش ہے۔ حالی کی یادگارِ غالب اور مالک رام کی ذکرِ غالب کے ساتھ اس کا مطالعہ نہ صرف ضروری ہے بلکہ لطف سے بھی خالی نہیں۔ یہ خیال تر و تازہ ہو گیا کہ ،، حقیقت افسانہ اور افسانہ حقیقت ہو سکتا ہے۔ اگر قلم کار میں قوتِ تخلیق توانا ہو۔ آپکے قلم نے افسانہ کو تاریخ اور تاریخ کو افسانہ کی تاثیر دے دی ہے۔ جیسے امتیاز علی تاج کی ،، انار کلی ،، یا پروفیسر مجیب کی ،، خانہ جنگی عا۔

اس ڈرامے میں کردار بھی عام ڈراموں کی طرح ہیں۔ مرکزی کرداروں میں مرزا غالب اور ترک بیگم ہیں تو ضمنی کرداروں میں امراؤ بیگم، کلّو میاں، وفادار، کلیانی، نیاز علی، نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، نصیر الدین کالے میاں، پنڈت شیوجی رام، بڑی بی داروغہ اور فرنگیوں کے کردار اپنی اپنی جگہ کامیاب ہیں۔

عا۔ شکست کی آواز۔ مصنفہ طارق جمیلی۔ سرورق کا صفحہ

ظاہر ہے کہ ڈراما کا ہیرو غالب ہے اور اسکی شخصیت اور زندگی کی بھرپور عکاسی اسکے کردار سے واضح ہوتی ہے غالب اعلیٰ ادبی صلاحیت اور رنگارنگ طبیعت کا مالک ہے ۔ وہ حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ شروع سے آخر تک ڈرامے میں موجود رہتا ہے۔غالب کا کردار مصنف نے محققانہ انداز میں پیش کیا ہے۔جس سے کردار میں واقعیت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے

ترک بیگم اس ڈرامے کی ہیروئن ہے۔ مصنف نے اُسے ایک بہادر خاتون اور کامیاب شاعرہ کی حیثیت سے اس ڈرامے میں پیش کیا ہے۔ اس طرح سے غالب کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ترک بیگم کا کردار بھی انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔

مکالمے کا استعمال غالب جیسے عظیم شاعر کے شایانِ شان، ہنرمندی سے کیا گیا ہے۔جس سے سچی تصویر کی عکاسی ہوتی ہے اور جابجا غالب اور اس زمانے کے دیگر شعرا کے اشعار وگفتار کو بڑے ہی موقع ومحل سے اس ڈرامے میں پیش کیا گیا ہے ۔اس سے ڈرامے کی دلچسپی اور کامیابی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔

الغرض بہار کا یہ پہلا ڈراما جو غالب پر لکھا گیا ہے ان پر لکھے گئے دوسرے ڈراموں پر حاوی ہے۔اسکی مسلم حیثیت مسلم ہے۔کیونکہ غالب اور ان کے زمانے کے

ملنے والوں کے مزاج اور ان کے ماحول کے ساتھ ساتھ ان کے کلام پر بھی تحقیقی روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح مصنف کا یہ ڈراما اب تک اردو ادب میں غالب پر لکھے جانے والے ڈراموں میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔

"استاد شیرو" نامی ایک ڈراما طبع شدہ ملا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی نے بدر عظیم آبادی کے فرضی نام سے اسے تحریر کیا ہے۔ دراصل یہ ڈراما ایسے لوگوں پر طنز ہے جو ٹھگ ٹھگ کر لوگوں سے چندہ وصول کرتے ہیں اور چندے کی ساری رقم کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ قصہ بڑا ہی دلچسپ اور مزاحیہ ہے اس ڈرامے کا ہیرو استاد شیرو ہے جو عوام کو دھوکا دے کر چندہ وصول کرنے میں بڑا ہی ماہر ہے مختصر یہ کہ یہ ایک، طربیہ اور مزاحیہ کے ساتھ ساتھ اصلاحی ڈراما بھی ہے مکالمے اچھے انداز میں استعمال ہوئے ہیں۔ ڈراما پڑھنے سے ہی اسٹیج کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ایک طویل اور دلچسپ ڈراما ہے

ڈراما "خسرو و شیریں" سمیع الحق کی ایک تاریخی اور فن کارانہ تخلیق ہے۔ دراصل یہ ڈراما امیر خسرو کی مشہور فارسی مثنوی خسرو شیریں کا چربہ ہے۔ مصنف نے بڑے ہی فنکارانہ طور پر اسے ڈراما کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اور ساتھ ہی امیر خسرو

کی شاعرانہ عظمت کو سراہا بھی ہے۔

ڈرامے کا پلاٹ مشہور تاریخی قصہ شیریں فرہاد اور بادشاہِ وقت خسرو پر مبنی ہے۔ کہانی میں فرہاد کا انجام المیہ ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی خسرو کا انجام بھی اس ڈرامے میں المیہ دکھایا گیا ہے جو تحقیق طلب ہے۔ اس کے باوجود قصہ دلچسپ اور دلکش ہے شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ دراصل یہ ڈراما داستانی رنگ لئے ہوئے ہے اور کسی حد تک کامیاب بھی ہے۔ بہار کے اردو ڈراموں میں یہ ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔

اس ڈرامے میں کرداروں کی بہتات ہے مرکزی کرداروں میں خسرو پرویز، شیریں اور فرہاد آتے ہیں۔ ڈرامے کا ہیرو خسرو پرویز ہے۔ شیریں نے ہیروئن کا رول ادا کیا ہے۔ فرہاد ایک اہم کردار ہے۔ مصنف نے فرہاد کے کردار کو مثالی کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ اسکے کردار میں محبت، وفا اور خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ضمنی کرداروں میں شاپور، بزرگ امید وزرار، مخر، وپرویز کی ملکہ، دو کسان اور دونوں کی بیویاں اپنے اپنے انداز میں خوب ہیں۔ کردار نگاری کے اعتبار سے یہ ڈراما مکمل ضرور ہے۔ لیکن کردار کی تعداد کثیر ہے۔

اسکے مکالمے کچھ کمزور ہیں کیونکہ اکثر مکالمے طویل نثر میں اور کبھی مثنوی کی بحر میں طوالت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں

جس سے قارئین کو اکتاہٹ ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی احساس
ہوتا ہے گویا یہ ڈراما نہیں مثنوی ہی ہے۔ یہ ڈراما دراصل
امیر خسرو کی مثنوی "خسرو شیریں" سے ماخوذ ہے لیکن
خسرو کی تصنیف فارسی میں ہے اور سمیع الحق نے اس ڈرامے کو
اردو میں تحریر کیا ہے۔ منظوم مکالموں کا استعمال انھوں نے
اس طرح کیا ہے کہ یہ ان کی اپنی تخلیق معلوم ہوتی ہیں ساتھ
ہی مصنف اپنے انفرادی انداز اور اسلوب بیان سے مثنوی اور
ڈرامے میں نمایاں فرق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس
ڈرامے کو اسٹیج پر بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ مختصراً یہ ڈراما
داستانی رنگ لیے قدیم کلاسیکی ڈراموں کی یاد تازہ کرتا ہے
بہار کے ڈراموں میں جہاں یہ انفرادی مقام رکھتا ہے۔ وہیں
اردو ڈراموں کی تاریخ میں ایک اضافہ ہے۔ قارئین اس کے
مطالعہ سے دلچسپی کے ساتھ تاریخی واقعات پر مبنی حالات کا
عکس دیکھ سکتے ہیں۔

سمیع الحق نے ایک ڈراما "بھیگی بستی" کے نام سے بھی لکھا ہے جو
موجودہ سماج کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ڈرامے کا پلاٹ سماجی
حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔ یہ شاہد اور اس کی بیوی کی غریبی
مکان مالک اور پونجی پتی کی آمریت پر ایک کہانی ہے۔ شاہد ہمیشہ
معاشی بدحالی میں گرفتار رہتا ہے۔ وہ وقت پر مکان کا کرایہ

دینے اور دیگر ضروری اخراجات کو پورا کرنے سے قاصر ہے ہمیشہ بہانا اور حیلہ بازی سے کام لیتا ہے۔ یہاں تک کہ مکان مالک کو بھی دھوکے دے دیتا ہے۔ اور منطقی طور پر اس کا بھائی بن جاتا ہے۔ جب راز فاش ہوتا ہے اور پولیس مداخلت کرتی ہے تو وہاں بھی وہ اپنی فطری خصلت سے باز نہیں آتا ہے مصنف نے بڑے ہی دلچسپ اور دلکش انداز میں یتیم خانے میں پروردہ شاہد کی زندگی کی عکاسی کی ہے اور شاہد کی زبانی موجودہ یتیم خانہ کے حالات کا تجزیہ کیا ہے۔ شاہد کہتا ہے کہ جہاں یتیم خانہ کے پروردہ کو بھیک مانگنے کا انداز سکھایا جاتا ہے وہیں اسے گفتگو کرنے کی مشق بھی کرائی جاتی ہے اور مصنف نے ایسے اداروں کے ماحول کی سچی عکاسی کی ہے۔ اسکے علاوہ موجودہ زمانے کے پولیس والوں کی بے جا حرکت کو بھی بڑی خوبصورتی سے اس ڈرامے میں پیش کیا ہے۔ پولیس والے شاہد سے روپیے کی مانگ بطورِ رشوت کرتے ہیں۔ جب شاہد روپیہ دینے سے مجبوری ظاہر کرتا ہے تو وہ اسکے گھر سے ٹوٹا پھوٹا کھانے کا برتن بھی اٹھا لے جاتے ہیں۔ شاہد اور اسکی بیوی مکان چھوڑنے میں ہی اپنی خیریت سمجھتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک جدید مختصر کامیاب ڈراما ہے اصلاحی نقطۂ نظر سے یہ بہت ہی مؤثر اور کامیاب ہے۔

اردو میں اب تک دنیا کے بہترین ڈراموں کا خاطر خواہ

ترجمہ نہیں ہو سکا ہے۔ بہار کے سمیع الحق اردو کے چند اہم ادیبوں میں ہیں۔ انہوں نے دو قدیم ڈرامے کا کامیابی کے ساتھ اردو میں ترجمہ کیا اور ساتھ ہی ایک آدھ تخلیق بھی کی ہے۔ سمیع الحق نے سوفوقل (کذا) کے یونانی ڈرامے شہنشاہ اڈی پیلپس اور انطی گونی کا اردو ترجمہ پیش کرکے ایک بیش بہا خدمت انجام دی ہے ساتھ ہی ان ڈراموں میں مصنف نے تعارف کے عنوان کے تحت فن ڈرامانگاری اور اسکی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے مصنف نے بڑی شگفتگی اور عمدہ طریقے سے ان ڈراموں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ جو حقیقتاً ترجمہ نہیں بلکہ تخلیق معلوم ہوتا ہے اردو زبان میں یہ ایک مفید کام اور اہم اضافہ ہے۔

ڈراما "ساگر اور لہریں" ، اکھبہار کے ڈراموں ہی میں نہیں بلکہ اردو کے اہم ڈراموں میں شمار کیا جانا چاہیئے۔ کیونکہ ڈراما نگار نے آغا حشر کاشمیری جیسے فن کار کی طرح انگریزی ناول کو ڈرامے کے قالب میں ڈھالا ہے۔ یہ بظاہر ڈراما نگار کی اپنی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ سید ظہیر احسن نے تھامس ہارڈی کے مشہور ناول سے

(The mayor of the Caster bridge).

کے پلاٹ پر مبنی ڈراما پیش کیا ہے۔ چونکہ ہارڈی کے ناول دلچسپ ہوتے ہیں لہذا وہی دلچسپی اس ڈرامے میں بھی شروع سے آخر تک برقرار ہے۔ کردار اور واقعات کو ہندوستانی رنگ دیا ہے قصہ انگریزی ضرور ہے لیکن ہمارے ہندوستانی سماج میں عام طور پر اس قسم کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ:۔
اختر احسن شراب کا عادی تھا اور شراب کے لیئے ہر چیز کو قربان کر دینے میں اسے کوئی تامل نہ تھا۔ اسی فطرت کے تحت ایک شام وہ اپنی حسین بیوی کو چند روپیوں کے عوض نیلام کر دیتا ہے۔ گو اسکی بیوی اسطرح نیلام ہونے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں تھی۔ لیکن مرد کی ظالمانہ حرکت کو مصنف نے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ دنیا کی مظلوم عورتوں کی بے بسی کا مکمل نقشہ کھینچا ہے۔ گو یا خیال ہارڈی کے ہیں لیکن ہندوستان میں بھی عام طور پر یہ روایت قائم تھی

اور آج بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں اس قسم کے واقعات یہاں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ مصنف نے ڈرامے میں اصلاحی پہلو کو بڑے ہی پُراثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ظلم کی ماری بیوی ایک ملاح کی زر خرید بیوی بن جاتی ہے اور سمندر کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ وہ ملاح اپنے پیشے کے سلسلے میں سمندر چلا جاتا ہے اور وہ حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ ملاح تو بچ جاتا ہے۔ لیکن وہ سمندر کے دوسرے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اسے اپنے خاندان اور بیوی سے ملنے میں بہت دیر ہو جاتی ہے۔ اسکی زر خرید بیوی مایوس ہو کر اپنی بچی کے ساتھ بھٹکتے بھٹکتے پہلے شوہر کے پاس آجاتی ہے۔ کچھ دن دونوں کی زندگی بڑی خوشگوار گذرتی ہے۔ پھر یکایک اس کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے وہ مرنے سے پہلے ایک خط لکھ جاتی ہے۔ جسمیں اس بچی کی اصلیت کا راز تحریر ہوتا ہے کہ یہ بچی شوہر کی نہیں ہے بلکہ دوسرے شوہر ملاح کی بچی ہے پہلی بچی مر چکی ہے اور پہلی بچی کے نام پر اس نے اس بچی کا نام رکھا ہے۔ پھر ملاح اپنے بیوی بچے کی تلاش کرتے کرتے اختر احسن کے مکان پر آتا ہے وہ اپنی بیوی اور بچی کے بارے میں پوچھتا ہے بیوی تو اسے نہیں ملتی ہے لیکن بچی ضرور مل جاتی ہے۔ قصہ بے حد دلچسپ اور دلکش ہے۔ اختر احسن کی بری فطرت و عادت اور اسکے غلط عمل کی وجہ سے قدرت اسے سزا دیتی ہے وہ۔

بیوی اور بچی دونوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس ڈرامے میں مرکزی اور ضمنی دونوں ہی کردار موجود ہیں مرکزی کردار میں اختر احسن اسکی بیوی شہناز اور افضل ملاح ہیں ضمنی کرداروں میں سراج، زہرہ جبیں، انور قاسم، شمشاد، حسن کلو، سلمیٰ اور شبیر وغیرہ آتے ہیں۔ یہ ایک سماجی اور اصلاحی ڈراما ہے لیکن طویل اور لمبے مکالمے سے ڈراما کمزور معلوم ہوتا ہے چونکہ یہ مصنف کی پہلی کوشش ہے اس لیے قابل قدر ہے اور مستقبل میں ان سے اچھے ڈرامے کی تخلیق کی توقع ہے

''دوپہر کے بعد''، شفیع مشہدی کے مختصر ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ اس میں درج ذیل ڈرامے ہیں۔ اجنبی دیواریں دوسرا کینسر، دوپہر کے بعد، انگلیاں فگار اپنی، پتھروں کا شہر اور مٹھی بھر خاک،۔

ان کے ڈراموں کی خاصیت یہ ہے کہ ان کے تمام ڈرامے ریڈیو پر نشر ہو چکے ہیں۔ ساتھ ہی کچھ ردو بدل کر کے آسانی سے انھیں اسٹیج بھی کیا جا سکتا ہے شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کے ڈراموں کے بارے میں صحیح فرمایا ہے۔

> ''شفیع مشہدی کے ڈراموں کی نمایاں خوبی مکالموں کی برجستگی ہے۔ ڈراموں کے بعض ایسے طریقے جو اسٹیج پر با آسانی پیش کیے جا سکتے

ہیں۔ مثلاً فلیش بیک مناظر کی کثرت
یا تنوع ان کا استعمال مشہدی نے بڑی خوبی
سے کیا ہے۔"[1]

ڈراموں کے واقعات کو مصنف نے مکالموں کے ذریعہ فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے جس سے ڈراموں کی دلچسپی اور دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے۔ مصنف فن ڈرامانگاری سے اچھی طرح واقف ہیں ان کے ڈراموں کا یہ مجموعہ زندگی کے کئی مسائل اور مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ ان کے تمام ڈرامے اصلاحی اور کامیاب ہیں۔

ریڈیائی ڈرامانگاروں میں بہار کے ڈرامانگار شین مظفر پوری اہم مقام رکھتے ہیں۔ انکے مختلف ڈرامے پٹنہ اور دیگر ہندوستانی ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہو چکے ہیں۔ اور بعد میں انھوں نے "خون کی مہندی" کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا جو دو سو کا نوٹ، انٹرویو کا چکر، سرکس کا شیر، تیسری آنکھ، انوکھی بات، بیچارہ شاعر، اور خون کی مہندی نام کے ڈراموں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کے ڈراموں میں سو کا نوٹ، انٹرویو کا چکر، سرکس کا شیر، اور بے چارہ شاعر طنزیہ اور اصلاحی ڈرامے ہیں لیکن ساتھ ہی سماج میں ہونے والے واقعات کو بڑے دلچسپ اور دلکش طور پر ان ڈراموں میں پیش کیا گیا ہے۔ پڑھنے کے بعد قارئین کو جہاں ہنسی آتی ہے وہیں ان کو کچھ مسائل پر

---

[1] دوپہر کے بعد: مصنفہ شفیع مشہدی پس منظر ص ۱

سوچنے سمجھنے پر بھی مجبور ہونا پڑتا ہے۔ یوں تو اس مجموعہ کا شاہکار
ڈرامہ "خون کی مہندی" ہے جو آج کے ہندوستانی ماحول میں کینسر
کی طرح لاعلاج مرض جہیز پر مبنی ہے۔ اس مختصر ڈرامے میں
مصنف نے ہندوستانی معاشرے کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے
اور بڑے ہی دلچسپ اور فنکارانہ انداز میں جہیز کی لعنت کو اس
ڈرامے میں انجام تک پہنچایا ہے۔ شادی تو ہو جاتی ہے لیکن
دولہا سہاگ رات میں دلہن سے ملنے کے بجائے اسکی لاش سے ملتا
ہے۔ بعد میں اس کی موت کا راز دولہا کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے
والدین نے جہیز کیلئے کیا کیا ظلم لڑکی والوں پر کیا ہے۔ یہاں تک
کہ بیٹی کے والدین کو گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ تمام حادثات اور
واقعات کو مصنف نے چابک دستی سے ڈرامے میں دکھایا ہے
دلہن زہر کھا کر ہندوستانی سماج و ملک کے ٹھیکے داروں پر ایک
بھرپور طمانچہ لگاتی ہے۔ اس طرح یہ ایک اصلاحی اور کامیاب ڈرامہ ہے

ادبی معماروں میں سہیل عظیم آبادی کا مقام بلند ہے۔ انھوں نے مختلف اصناف ادب پر طبع آزمائی کی ہے۔ یوں تو فن ڈراما نگاری کی طرف کم توجہ دی ہے اس کے باوجود انھوں نے چند جدید ریڈیائی ڈرامے لکھے ہیں۔ جو بہار کے ڈراموں میں اہمیت کے حامل ہیں۔

عید کی ایک شام

یہ سہیل عظیم آبادی کا پہلا مختصر ڈراما ہے۔ جو عید جیسے مبارک تہوار کی خوشیوں کی دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے چنانچہ عید کے ہنگامہ اور پرمسرت ماحول کی پوری پوری عکاسی کرتا ہے۔ یہ کئی بار ریڈیو سے نشر بھی ہوچکا ہے۔

ایک ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

سہیل عظیم آبادی کا دوسرا اہم ڈراما ہے۔ یہ اردو کے عظیم شاعر غالب کے فن اور شخصیت پر مبنی ایک ریڈیو فیچر ہے اس ڈرامے میں مصنف نے غالب کے شایانِ شان مکالمے اور اشعار کا استعمال کیا ہے جس سے غالب کے مخصوص اندازِ فکر اخلاق و حسن کی ہمہ گیر انسانی جبلت اجاگر ہوتی ہے۔ یہ غالب کی زندگی کے علمی مذہبی اور اخلاقی پہلو پر ایک خوبصورت اور دلچسپ ڈراما ہے یہ بہار میں غالب پر لکھے گئے ڈراموں میں اضافہ ہے

جہاں آرا یہ ایک مشہور ریڈیائی ڈراما ہے۔ یہ پانچ سین پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامے میں مصنف نے شاہی خاندان کی بہنوں کی نفسیاتی محبت اور نفرت کا فنکارانہ تجزیہ کیا ہے۔ جہاں آرا اپنے باپ شاہجہاں اور اپنے بڑے بھائی دارا شکوہ سے اسقدر محبت کرتی ہے کہ وہ ہر قیمت پر انھیں ہی دہلی کے تخت پر دیکھنا چاہتی ہے۔ جبکہ روشن آرا دوسرے بھائی اورنگ زیب کو اسقدر چاہتی ہے کہ کسی قیمت پر وہ کسی اور کو دہلی کے تخت پر دیکھنا نہیں چاہتی۔ بالآخر اورنگ زیب اپنے بھائیوں کو شکست دیکر ہندوستان کا شہنشاہ بن جاتا ہے۔ جہاں آرا اورنگ زیب سے اسقدر نفرت کرتی ہے کہ جب اورنگ زیب جہاں آرا کی بیٹی کے ساتھ اپنے بیٹے کی شادی کیلئے قاصد بھیجتا ہے تو اسے اس حد تک افسوس اور غم ہوتا ہے کہ اس کا ہارٹ فیل کر جاتا ہے۔ اس طرح یہ تاریخی ڈراما المیہ طور پر ختم ہوتا ہے۔ یہ سہیل عظیم آبادی کے ڈراموں میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ بہار کے تاریخی اردو ڈراموں میں یہ ایک اہم اضافہ ہے اور فنی اعتبار سے یہ ایک کامیاب ڈراما ہے

اس کے علاوہ انھوں نے ایک اور ڈراما "دبستان عظیم آباد" کے نام سے تحریر کیا ہے۔ یہ ان کا آخری ڈراما ہے۔ یہ ڈراما عظیم آباد (پٹنہ) کے مشہور و معروف شعرائے کرام

کا تفصیلی تعارف ہے۔اس میں ماضی کے شعرا کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔تمام شعرا کی زبانی ان کے اشعار سے ان کی ادبی شخصیت کی بھرپور تصویر کشی کی گئی ہے۔یہ ایک کامیاب ڈراما ہے بہار کے اردو ادیبوں میں قمرالتوحید ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔اردو افسانے کے ساتھ ساتھ ڈرامانگاری میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔یوں تو ان کے ڈرامے انگریزی ادب سے ماخوذ و متاثر نظر آتے ہیں لیکن انھوں نے ان ڈراموں کو اردو کے قالب میں فنکارانہ طور پر تخلیقی کرب کے ساتھ ڈھالا ہے۔

ڈراما "گوداوری کی گود میں" ان کے ڈراموں میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔یہ مصنف کا پہلا ڈراما ہے اس کا قصہ دلچسپ اور المناک ہے۔قصے کے اعتبار سے یہ ڈراما کامیاب ہے۔قصہ یوں ہے کہ خانم نامی عورت کے ساتھ حادثہ ہوتا ہے کہ اس کا شوہر اور چھ بیٹے گوداوری ندی کی طوفانی موجوں میں ڈوب جاتے ہیں اور وہ بے سہارا ہو جاتی ہے۔اس طرح سے خانم کا تمام اثاثہ اور امیدیں ختم ہو جاتی ہیں۔اس کے باوجود اسکے صبر و تحمل نے اسے لافانی بنا دیا ہے۔

کردار قدرے کم ہیں۔مرکزی کرداروں میں خانم اور اس کا بیٹا داؤد آتے ہیں تو ضمنی کرداروں میں میر جان، نوری، چند عورتیں اور مرد آتے ہیں اور تمام کردار اپنی اپنی جگہ کامیاب ہیں

البتہ خانم کا کردار ایک مثالی کردار بن کر اس ڈرامے میں ابھرتا ہے۔ وہ صبر و تحمل کی دیوی معلوم ہوتی ہے کردار نگاری کے اعتبار سے یہ ڈراما کامیاب ہے۔

مکالمے کے اعتبار سے یہ ڈراما کچھ کمزور معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بعض بعض مقام پر لمبے جملے استعمال ہوئے ہیں۔ جو فن ڈراما نگاری کے اعتبار سے بے جا ہیں۔ لیکن مجموعی اعتبار سے یہ کامیاب ڈراما ہے۔ اور ان کے ڈراموں میں شاہکار کا مرتبہ رکھتا ہے۔

مصنف کا دوسرا ڈراما "ممی کا پنجہ" ہے۔ کالج کے طلبا نے اسے اسٹیج پر پیش کیا ہے۔ اگرچہ اس کا قصہ پیچیدہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود ڈرامے میں شروع سے آخر تک تجسس برقرار رہتا ہے کردار قدرے کم ہیں جو اسٹیج کے لیے معقول ہیں۔ مصنف نے قصے کو فنکارانہ طور پر کرداروں کی زبانی ترتیب دیا ہے جس سے ڈراما دلچسپ اور دلکش بن گیا ہے۔

مکالمے کے اعتبار سے یہ ڈراما کامیاب ہے۔ کیونکہ اس میں چھوٹے چھوٹے جملے استعمال ہوئے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ڈراما کامیاب ہے۔

مصنف کا تیسرا اور اب تک کا آخری ڈراما "عید کا دن" ہے۔ جو پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے نشر بھی ہو چکا ہے۔ اس کا

قصہ بڑا ہی دلچسپ اور مؤثر ہے۔ مصنف نے قصے میں فنکارانہ انداز
سے دولت مند لوگوں پر طنز کیا ہے جو بہت حد تک حقیقت
کی ترجمانی کرتا ہے۔ قصہ یوں ہے کہ ایک امیر خاتون اپنے شوہر
سے بے انتہا محبت کرتی ہے اسکی موت کے بعد وہ اسکے غم میں
رہتی ہے۔ اسی درمیان عید ہی کے دن اس کا ایک امیر دوست
اس کے پاس آتا ہے۔ اور اس سے کہتا ہے کہ تمہارے شوہر نے
مجھ سے جو روپے قرض لئے تھے انہیں واپس کر دو۔ چونکہ عورت
کا غم تازہ ہے وہ اس حالت میں اپنے شوہر کے دوست کو چلے جانے
کو کہتی ہے۔ اس پر وہ شخص نہ صرف اسکو بلکہ دنیا کی تمام عورتوں
کو بے وفا کہتا ہے۔ یہ سنکر وہ برہم ہو جاتی ہے اور اسے جواب دیتی
ہیکہ مرد ہی بے وفا ہوتے ہیں اور اسکے ثبوت میں وہ اپنے مرحوم
شوہر کی مثال پیش کرتی ہے۔ اس طرح سے یہ ڈراما المیہ طور پر
ختم ہوتا ہے۔ پلاٹ نگاری کے اعتبار سے یہ ڈراما کامیاب ہے
اس ڈرامے میں کردار قدرے کم ہیں۔ مرکزی کردار میں سعیدہ
بیگم ہیں جو اس ڈرامے کی ہیروئن ہیں۔ ضمنی کرداروں میں اس
کی بھابی اور عاشق حسین ہیں۔ عاشق حسین نے اس ڈرامے
میں ویلن کا رول ادا کیا ہے۔ اس ڈرامے کے تمام کردار اپنی
اپنی جگہ کامیاب ہیں۔

ڈرامے کا سب سے دلچسپ عنصر اس کا مکالمہ ہے مصنف نے

اس ڈرامے میں چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کیے ہیں اور بعض جگہ اسلامی تاریخ کو بھی بڑے ہی موقع و محل سے استعمال کیا ہے جیسے ڈراما بہت ہی مؤثر بن گیا ہے مثلاً "اصحابِ کہف" کے تاریخی واقعہ کو مکالمے میں استعمال کیا ہے جس سے مصنف کے عمیق مطالعے اور صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے مجموعی طور پر یہ ڈراما اپنے آپ میں منفرد اور ادبی اہمیت کا حامل ہے۔

جدید دور کے مزاحیہ نگار ڈراما نگاروں میں تمنا مظفر پوری کا ایک اہم مقام ہے۔ ان کا اصلی نام اسرار احمد ہے۔ انھوں نے اردو ڈراما نگاری میں طنز و مزاح کا رنگ بھر کر ڈراما کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ یوں تو ان کا ایک ہی ڈرامے کا مجموعہ بہ عنوان "پردے کے سامنے" کتابی شکل میں آیا ہے۔ اس مجموعہ کے ڈراموں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمنا مظفر پوری کی فطرت میں فن ڈراما رچا بسا ہے۔ چنانچہ ابراہیم یوسف نے ان کے ڈراموں پر جو رائے قائم کی ہے وہ بہت حد تک صحیح ہے

> "تمنا مظفر پوری اپنے ڈراموں کی بنیاد ان معمولی باتوں پر رکھتے ہیں جو بالعموم معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ اس سے ان کے ڈراموں میں کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ ان معمولی باتوں میں طنز کا پہلو نمایاں

ہوتا ہے۔ لے

مجھے انصاف چاہیئے:۔ تمنا مظفر پوری کا یہ پہلا اور دلچسپ ڈراما ہے۔ جس میں نہ صرف آج کے پراگندہ ماحول اور کرپٹ سوسائٹی کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے بلکہ اِس زوال پذیر سماج پر بھرپور طنز بھی موجود ہے۔ قصہ بڑا ہی دلچسپ ہے۔ رمیش کمار نامی شخص اپنی نوکری حاصل کرنے کے سلسلے میں حاکم وقت کے یہاں خود چوری کی ہوئی رقم اور زیور بطور رشوت دیتا ہے۔ اور پکڑے جانے پر ان کے وکیل صاحب، جج صاحب کو یہ بتانے میں کامیاب ہوتے ہیں کہ رمیش کمار چور نہیں ہے بلکہ آپ کا عملہ رشوت خوری میں مبتلا ہے اور یہی رشوت کے چلن نے اُسے ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ ورنہ یہ ایک ایماندار شخص ہے۔ اس طرح حاکم وقت کے دل و دماغ میں رشوت جیسی عِلّت کا احساس ہوتا ہے۔ پلاٹ نگاری کے اعتبار سے یہ ڈراما کامیاب ہے۔

"بیگم کا گھریلو بجٹ":۔ یہ عورت کی نفسیات پر ایک دلچسپ ڈراما ہے۔ یہ ڈراما کئی بار ریڈیو سے نشر ہو چکا ہے یہ دو سین پر مشتمل مختصر ریڈیائی ڈراما ہے۔ دراصل یہ ایک میاں بیوی پر لکھا طنزیہ اور دلچسپ ڈراما ہے۔ بیگم گھر کا بجٹ خود بناتی ہے تاکہ کچھ روپیہ مستقبل کیلئے بچایا جا سکے لیکن جب بیگم خود بازار جاتی ہیں تو اپنی ضروریات کی چیزیں پہلے بنا سوچے

ع لے پردے کے سامنے، مصنفہ تمنا مظفر پوری۔ صہ آخری ٹائیٹل پیج۔

خرید لاتی ہیں۔ اور اس طرح بجٹ فیل ہو جاتا ہے۔ اس لئے آخر میں بیگم بجٹ بنانے سے باز آتی ہیں۔ فنی اعتبار سے یہ ایک کامیاب ڈراما ہے۔

"قصہ کراسن تیل کا:۔ مصنف کا یہ ڈراما اسقدر دلچسپ ہے کہ اب بھی گاہے بگاہے ریڈیو پر نشر ہوتا رہتا ہے۔ اور لوگوں کے دلوں کو کھینچ لیتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ نریش سنہا نامی شخص ایک رات کراسن تیل نزدیک کی دوکان سے خرید لاتا ہے تاکہ وہ اپنے گھر آئے مہمان کیلئے کھانا پکا کر کھلا سکے۔ دوسرے دن فرصت ہونے کی وجہ سے صبح دیر تک دروازہ بند کر کے آرام کر رہا ہوتا ہے کہ پڑوس کے لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ضرور نریش سنہا نے اپنی بیوی کو رات کراسن تیل چھڑک کر مار ڈالا۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ لوگ پولیس کو خبر کر دیتے ہیں۔ دروازہ کھولنے پر حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ اس طرح پڑوس کے لوگ اور پولیس بے جا پریشان اور شرمندہ ہوتے ہیں۔ فنی طور پر یہ ایک کامیاب ڈراما ہے

مجھے پھانسی دیدو:۔ مصنف کا یہ جدید دور کا موڈرن لڑکیوں پر لکھا ایک طنزیہ اور اصلاحی ڈراما ہے۔ قصہ یوں ہے کہ ایک موڈرن لڑکی کالج کی سند حاصل کر کے اپنے آپ کو زیادہ عقلمند سمجھ لیتی ہے احساس برتری میں مبتلا

ہو کر اپنے شوہر سے بات بات پر جھگڑ پڑتی ہے۔ اپنے جذبات پر خود قابو نہیں رکھ پاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود اپنی جان سے ہاتھ دھو لیتی ہے۔ اور اپنے خاندان والوں کو دشواریوں اور زحمتوں میں ڈال جاتی ہے۔ پلاٹ کے اعتبار سے یہ ڈراما آج کے سماج کی حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ڈرامے کو باآسانی اسٹیج بھی کیا جا سکتا ہے۔ المختصر یہ ایک طنزیہ اور اصلاحی کامیاب ڈراما ہے:

انٹرویو بورڈ:۔ یہ بھی اس مجموعہ کا مختصر طنزیہ ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں مصنف نے موجودہ سماج پر گہرا طنز کیا ہے۔ پلاٹ بھی بڑا دلچسپ اور حقیقت پر مبنی ہے۔ چنانچہ انٹرویو بورڈ کا چیرمین اپنی بیٹی کی شادی کیلئے ہی انٹرویو کراتا ہے۔ اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کیلئے تمام قابل لڑکوں کو نظر انداز کر کے ان کے حق کو مار لیتا ہے اور اس طرح موجودہ دور کا انسان اسقدر خود غرض اور لالچی ہو گیا ہے کہ اپنے مقصد کے لئے ہمہ وقت ناجائز طریقے کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ہے۔ یہ فنی طور سے ایک کامیاب ڈراما ہے۔

گرام پنچایت:۔ یہ ڈراما عظیم ادیب پریم چند کے جشن صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر لکھا گیا ہے۔ یہ تمنا مظفر پوری کا بہترین ادبی اور سنجیدہ ڈراما ہے۔ لیکن طنز کا رنگ جا بجا نمایاں ہے۔

مصنف نے الگو چودھری، شیخ جمن کے ساتھ پریم چند اور دیگر لوگوں کو فنکارانہ اور موثرانہ طور پر کردار بنا کر پیش کیا ہے دراصل موجودہ جمہوری سسٹم کو ڈھونگ بتایا ہے۔ جو بہت حد تک حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ آج ہندوستان کی عوامی نمائندگی عنقا ہو گئی ہے۔ اور سیاست میں غلط لوگوں کے گھس بیٹھ سے ہندوستان میں افراتفری اور پورا سماج کرپٹ اور پراگندہ ہو گیا ہے۔ قصہ بڑا ہی دلچسپ اور حقیقت پر مبنی ہے۔ کیونکہ پریم چند کے افسانے "پنچایت" پر مبنی ہے۔

اس پراگندہ ماحول میں کسی بھی شہری کو اس کا حق وانصاف ملنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے بتایا ہے کہ ہندوستان کے عظیم ادیب پریم چند کو بھی اس کا حق نہیں مل سکا۔ اسکی ترجمانی خود ان کی تحریر کے مکالمے کے ذریعہ بڑے ہی فنکارانہ انداز میں کی گئی ہے

چنانچہ ان کے افسانے "پنچایت" اور موجودہ "گرام پنچایت" کا تقابلی تجزیہ بڑے ہی فنکارانہ انداز میں کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ موجودہ "گرام پنچایت" کوئی صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کے نمائندے بدبخت اور بدکردار لوگ الکشن کے ذریعہ آتے ہیں۔ اس طرح مصنف نے بڑے دلکش انداز میں حقیقت کی عکاسی کی ہے۔ جو الکشن کا طریقہ ہے وہ

بالکل غلط قسم کے لوگوں کیلئے ہے۔ صحیح نمائندگی اس موجودہ سسٹم میں ناممکن ہے۔

اس کے علاوہ اس ڈرامے میں پریم چند کے خیالات وافکار کو دلچسپ طور پر پیش کیا گیا ہے۔ پریم چند نے اپنی تخلیقات کو فلم کے ذریعہ عام لوگوں تک پہنچانے کی بھی سعی کی لیکن ان کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ کیونکہ ان کی نظر میں مغربی تہذیب پر مبنی ذریعہ ابلاغ ہے۔ اور اس پر بڑے بڑے پونجی پتی لوگوں کی اجارہ داری اور قبضہ ہے۔ چنانچہ پریم چند کہتے ہیں۔

"یہ صنف بھی اسی طرح سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہے جیسے شراب فروشی۔ انہیں اس سے بحث نہیں کہ پبلک کے مذاق پر کیا اثر پڑتا ہے۔۔ انہیں پیسے سے مطلب ہے۔ برہنہ رقص، بوسہ بازی اور مردوں کا عورتوں پر حملہ، یہ سب ان کی نظروں میں جائز ہے۔ پبلک کا مذاق اتنا گر گیا ہے کہ جب تک یہ حیا سوز نظارے نہ ہوں اسے تصویر میں مزا نہیں آتا۔ سماج کی اصلاح کا بیڑا کون اٹھائے۔ سینما کے ذریعہ مغرب کی یہ بیہودگیاں ہمارے اندر داخل کی جارہی ہیں

اور ہم بے حس ہیں۔ سائنس ایک برکت
ایزدی ہے مگر نااہلوں کے ہاتھ میں پڑ کر
لعنت ہو رہی ہے"۔ ع۱

پریم چند اپنے زمانے کے پہلے ہندوستانی ادیب ہیں جو ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں لکھتے اور چھپتے رہے ہیں۔ اسی بنا پر خود اپنے آپ کو ہندوستانی زبان کا ادیب بتاتے ہیں۔ اور جدید "گرام پنچایت"، میں خود کو پیش کر کے فیصلہ لینا چاہتے ہیں کہ میں کون سی زبان کا مصنف ہوں؟ لیکن ڈرامے کا مصنف فیصلہ ہونے سے قبل ہی بڑے ڈرامائی انداز میں بغیر فیصلہ کے اختتام تک پہنچا کر عوام پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیتا ہے۔

الغرض یہ ڈراما ایک طرف موجودہ "گرام پنچایت"، اور موجودہ طریقہ الکشن اور جدید ہندوستانی جمہوریت پر گہرا طنز ہے تو دوسری طرف مصنف نے عظیم ہندوستانی ادیب پریم چند کی پُر وقار ادبی شخصیت کو کردار بنا کر ان کے خیالات کا بھر پور تعارف کرایا ہے۔ کاش پریم چند کے خیالات پر ہندوستانی جمہوریت قائم ہوتی تو ہندوستان کا مستقبل تابناک ہوتا اور دنیا کیلئے نشان راہ بنتا۔

اس کے باوجود مصنف کا یہ ڈراما فنی اعتبار سے کامیاب ہے۔ اسے باآسانی اسٹیج پر کھیلا جا سکتا ہے۔

ع۱ پردے کے سامنے، مصنفہ تمنا مظفر پوری ص ۲۲

جہیز کی ریل :- یہ ایک مختصر ڈراما افسانوی رنگ لئے ہوئے ہے۔ دراصل قصہ اس ڈرامے کا یہ ہے کہ چند نوجوان لڑکیاں ریل گاڑی پر سوار ہوتی ہیں۔ مگر انہیں سیٹ نہیں ملنے پر اِدھر اُدھر سیٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ چنانچہ سامنے کی ایک سیٹ پر ایک شخص بیٹھنے کے بجائے پورے سیٹ پر لیٹ کر آرام فرما نظر آتا ہے۔ اُسے دیکھکر لڑکیاں آپس میں کہتی ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ گاڑی ان کے باپ کی ہے۔ وہ شخص ان کے فقرہ کو سن کر اُٹھ بیٹھتا ہے اور جواباً کہتا ہے۔ نہیں ـــــ محترمہ ـــــ یہ گاڑی آپ کے باپ کی ہے اور مجھے جہیز میں ملی ہے۔ اس طرح مصنف نے بات سے بات پیدا کر کے اس ڈرامے کو دلچسپ اور مزاحیہ بنایا ہے۔

ساحر و ستم :- یہ تمنا مظفر پوری کا لکھا ہوا بچوں کے لئے پہلا اور اہم ڈراما ہے۔ یوں تو شیکسپیر کے مشہور ڈراما مرچنٹ آف وینس

THE, MERCHANT-OF VENICE

کا چربہ ہے۔ البتہ مصنف نے اس میں بچوں کے کردار کو نثری مکالمے کے ساتھ اشعار کا بھی استعمال کیا ہے جس سے ڈرامے میں جدت پیدا ہو گئی ہے۔ ڈراما اقبال کی مشہور نظم وہ بچوں کی دعا سے شروع ہوتا ہے۔ اور جا بجا آغا حشر اور دوسرے نامور شعرائے کرام کے اشعار کا بھی استعمال موقع محل کی مناسبت سے کیا ہے جس سے ڈراما دلچسپ اور پُر اثر ہو گیا ہے۔ یہ ڈراما چار

سین پر مشتمل کلاسیکل رنگ لئے ہوئے ہے ۔ چنانچہ بچوں کے ڈراموں میں یہ ایک اپنا منفرد مقام رکھتا ہے اور بہار کے ڈراموں میں ایک اہم اضافہ ہے ۔فنی طور پر بھی یہ کامیاب ہے۔

مچھلیوں کی عدالت: مجموعہ "پردے کے سامنے" کا یہ آخری ڈراما ہے ۔جو بچوں کیلئے لکھا گیا ہے ۔ یہ ایک تمثیلی ڈراما ہے ۔البتہ یہ ڈراما بچوں کو سمجھنے میں دشوار ہے ۔ تمثیلی انداز و کردار میں سامنے آتا ہے ۔گو کہ مصنف نے اس میں تمام مچھلیوں کو ان کی صفت کے مطابق نام دے کر کردار ادا کرتے ہوئے دِکھایا ہے ۔ یہ ڈراما دو مناظر پر مشتمل ہے ۔

الغرض مصنف کا یہ ڈراما اس مجموعہ کا سب سے کمزور ڈراما ہے ۔اسکے باوجود میرا خیال ہے کہ فن ڈرامہ نگاری کی طرف مصنف توجہ دیتے رہے تو ان سے اچھا اور معیاری ڈراما لکھنے کی توقع مستقبل میں کی جا سکتی ہے ۔

بہار کی پہلی خاتون ڈرامانگار شمیم افزا قمر کے اب تک صرف چار مختصر ڈرامے شائع ہوئے ہیں ۔اور یہ تمام ڈرامے ریڈیو سے بھی نشر ہو چکے ہیں ۔ان کا پہلا ڈراما "اُجالا باقی ہے" کا قصہ ادبی ماحول اور ہندوستانی ادیب و فنکار کی بے قدری پر مبنی ہے ۔ ادب کے قارئین کے لئے یہ ایک اہم موضوع ہے ۔جو آج کی حقیقت کی پوری پوری عکاسی کرتا ہے ۔

پیسے والے غیر سند یافتہ اشخاص دولت کے زور سے نام نہاد مصنف تو بن جاتے ہیں مگر ان میں تعلیمی اور تخلیقی صلاحیت عنقا ہوتی ہے۔ یہ غریب غیر سند یافتہ فنکار کی تخلیقات کو اپنے نام سے شائع کر کے سماج اور سوسائٹی میں اپنی جھوٹی عزت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مصنفہ نے فنکارانہ انداز میں پلاٹ کو ترتیب دیا ہے ایسے لوگ جو صرف اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے دوسروں کی نام نہاد مدد کرتے ہیں ان کی بھی قلعی کھولی ہے۔ بے چارہ معصوم اور سادہ دل مصنف ایسے لوگوں کی چال میں پھنس جاتا ہے۔ دوسری طرف کچھ اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جو مصیبت زدوں کی مدد کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں غرض کہ یہ ڈراما "اُجالا باقی ہے" پلاٹ نگاری کے اعتبار سے کامیاب ہے۔ مکالمے بھی بہت ہی دلچسپ پیرائے میں استعمال کئے گئے ہیں۔ حسبِ معمول مصنفہ نے ایک ادیب کی زندگی کو بڑے ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ہیرو کی ادبی صلاحیت میں وقار پیدا ہو گیا ہے۔ مرکزی کرداروں میں فیروز نظیر اور رُباب ضمیر خوب ہیں۔ ضمنی کردار میں نسیم احمد، عذرا وغیرہ ہیں مختصر طور پر اس ڈرامے کو اسٹیج پر کھیلا جا سکتا ہے۔ یہ موجودہ دور کا ایک معیاری ڈراما ہے۔

مصنفہ نے اپنے ایک افسانہ بعنوان "زمانہ بدل گیا"

کو "ٹرنکولا ئزر کی گولیاں" کے نام سے مختصر ڈرامے کے قالب میں ڈھالا ہے۔ موجودہ دور میں مرد اپنی بیوی کو ماڈرن بنا کر سماج اور سوسائٹی میں مہذب بننا چاہتا ہے۔ ایسی ہی نام نہاد مہذب سوسائٹی پر مبنی یہ ڈراما تحریر کیا گیا ہے جو موثر بھی ہے اور موجودہ سماج کی عکاسی بھی کرتا ہے۔

کیپٹن نیازی کی بیوی رئیسہ کو اپنی کمزوری، ناتوانی اور کمتری کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے وہ پڑھ لکھ کر نوکری کرتی ہے۔ رات دیر سے گھر آتی ہے۔ نیازی اور رئیسہ میں ہمیشہ جھگڑے ہوتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیازی شراب میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کی جوان بیٹی آج کی موجودہ سوسائٹی سے اس حد تک متنفر ہو جاتی ہے کہ وہ کالج کی تعلیم بھی چھوڑ دیتی ہے ماں سے یہ کہتی ہے کہ بدلے ہوئے زمانے میں تو آپ نے اپنی منزل پالی۔ لیکن میرے لئے زمانہ "ٹرنکولا ئزر کی گولیاں" بن گیا ہے اور میری منزل اسکی دھند میں غائب ہو گئی ہے۔ اسطرح مصنفہ نے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں موجودہ تعلیم یافتہ اور مہذب سماج پر گہرا طنز کیا ہے۔

مکالمے کے اعتبار سے یہ ڈراما کچھ کمزور ہے۔ لمبے لمبے فقرے اور جملوں کے استعمال غیر معقول معلوم ہوتے ہیں۔ سماج کی عکاسی کسی حد تک حقیقت کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے

اس لئے کہ ہمارا سماج ایسے ہی ماحول میں گردش کر رہا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک کامیاب طنزیہ و اصلاحی ڈراما ہے۔

"دیوان غالب" بہار کا دوسرا غالب کے اشعار اور غالب کی ہمہ گیر شخصیت پر مبنی مختصر ڈراما ہے۔ محترمہ شمیم افزا قمر کے اس ڈرامے نے بہت ہی مقبولیت اور شہرت حاصل کی ہے۔ در اصل یہ ایک مزاحیہ ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں ایک شاعر من موہن پرشاد غالب کے اشعار اور اسکی شخصیت سے اس طرح محبت کرتا ہے کہ دیوانگی کی حد پار کر جاتا ہے۔ قصہ یوں ہے کہ من موہن پرشاد نہ صرف غالب کے اشعار اور شخصیت سے ہی متاثر ہوتا ہے۔ بلکہ غالب کی محبوبہ سے متاثر ہو کر اپنی بیوی کو بھی غالب کی محبوبہ کے رنگ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اور اس کیلئے کوشش بھی کرتا ہے۔ وہ ہر بات کا جواب غالب کے اشعار میں دیتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہر موقع و محل پر غالب کے اشعار کے ذریعہ اپنا مقصد بھی حاصل کر لیتا ہے۔ بنیئے کی دوکان سے قرض لیتا ہے اور جب اس پر مقدمہ دائر کیا جاتا ہے تو عدالت میں بھی غالب کے اشعار کے استعمال سے حاکم کو متاثر کر دیتا ہے۔ من موہن کے وکیل کو اس عمل سے اسے رہا کرانے میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح قصے کا انجام مزاحیہ اور طربیہ ہے۔ مختصر ڈراموں میں یہ ایک کامیاب ڈراما ہے۔ کردار بھی قدرے کم ہیں۔ ریڈیو سے

بھی نشر ہوچکا ہے ۔ اور اسٹیج پر بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک کامیاب ڈراما ہے ۔

ڈراما "کتنے روپ" سہیل عظیم آبادی کے ناول "ایسے جبڑ کے پودے" سے کسی حد تک متاثر ہے ۔ یہ ڈراما بھی موجودہ سماج کے اہم مسائل پر مبنی ہے ۔ اس ڈراما کی ہیروئن ایک بوڑھے باپ کی بیٹی ہوتے ہوئے بھی طوائف کے پیشے کو ختم کرنے کی مہم چلاتی ہے ۔ اور آخر میں وہ خود ایک شخص کی محبت میں گرفتار ہوجاتی ہے ۔ ڈراما کی اٹھان سے ایسا لگتا ہے گویا اس کا انجام المیہ ممکن ہے ۔ لیکن نتیجہ طربیہ ہوتا ہے کہ ڈراما اپنے اختتام تک بھرپور تجسس قائم رکھتا ہے ۔ یہ ڈراما اصلاحی بھی ہے اور مثالی بھی لیکن مقصدیت کہیں پر بوجھل نہیں بنتی ۔ کاش آج کا سماج اس ڈرامے سے سبق لے! چونکہ ڈراما میں کردار قدرے کم ہیں اسلئے کردار کی عکاسی اچھی ہوئی ہے ۔ کہیں کہیں ہیروئن کے کردار میں مغربی جھلک نمایاں ہوجاتی ہے ۔

مکالمے کے اعتبار سے یہ ڈراما البتہ کمزور ہے ۔ کیونکہ بعض مقام پر لمبے فقرے اور عبارت کے استعمال سے قارئین کو اکتاہٹ کا احساس ہوتا ہے ۔ اس کے باوجود مجموعی طور پر یہ ایک اصلاحی اور کامیاب ڈراما ہے ۔ مصنفہ اگر فن ڈراما کی طرف توجہ دیتی رہیں تو مستقبل میں ان سے اچھے ڈرامے لکھے

جانے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

حال میں "کلاکار" نامی ڈراما نوید ہاشمی نے لکھا ہے یہ ڈراما بہت دلچسپ اور موثر ہے۔ قصہ موجودہ سماج کے حالات کی سچائی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ رتن سنگھ فن بت تراشی کا بہترین ماہر ہے۔ وہ اپنی غریبی اور بدحالی کو دور کرنے کیلئے بت تو ضرور بنا لیتا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اسکے فن کو چرا کر لے جاتے ہیں اور اسکی غربت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُسے مار بھی ڈالتے ہیں یہاں تک کہ اسکی اور اسکے خاندان کی تمام آرزوؤں اور ارمانوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ قصہ جہاں موجودہ سماج پر ایک بھرپور طنز ہے وہاں نصیحت آمیز بھی ہے۔ غریبوں اور کمزوروں کے استحصال کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔ یہ ایک المیہ ڈراما ہے۔

اس ڈرامے میں کردار کم ہیں اور مکالمے بڑے ہی سیدھے سادے انداز میں استعمال کیے گئے ہیں جس سے ڈراما دلچسپ اور کامیاب بن گیا ہے۔ ویسے مصنف کا یہ پہلا ڈراما ہے۔ مختصر ڈراموں میں یہ بہار کا ہی نہیں بلکہ اردو کے بہترین ڈراموں میں ایک اہم ڈراما ہے۔

اسکے علاوہ چند دوسرے لوگوں نے بھی مختصر اور طویل ڈرامے لکھے ہیں۔ ان میں ذکی انور اور سلطان آزاد خاص طور

پر قابلِ ذکر ہیں۔ ذکی انور کا ڈراما "آگ اور پھول"، بہار کے ہی نہیں بلکہ اردو کے بہترین ڈراموں میں شمار کیا جاسکتا ہے موجودہ دور میں سلطان آزاد کے ڈرامے نکتہ چین اور قصہ ایک شاعر کا، پٹنہ ریڈیو سے نشر ہوچکے ہیں۔ یہ دونوں ڈرامے مزاحیہ ڈراموں میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

"ایک نیا عہد نامہ"، موجودہ ہندوستانی فرقہ وارانہ واردات پر مبنی ایک کامیاب ڈراما ہے۔ اس ڈرامے کا پلاٹ دلچسپ اور مکالمے چست اور موثر ہیں۔ جگہ جگہ مصنف نے اپنے مکالمے میں قرآن، حدیث اور بڑے بڑے عالموں کے افکار کو بڑے ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ڈراما عظیم اقبال کا ہے۔ جو بہار کے مختصر افسانہ نگاروں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ، کوئی وعدہ نہیں"، مزاحیہ اعتبار سے انکا ایک کامیاب ڈراما ہے۔

"نولکھا ہار" اور کرشمہ محنت کا"، شمیم عالم مصطفیٰ کے ڈرامے بھی قابل توجہ ہیں۔ یہ دونوں ڈرامے اصلاحی ہیں۔ اور مختصر ڈراموں میں اہم اضافہ ہیں۔

بہار کے ادیبوں کو فن ڈراما نگاری کی طرف رجوع ہونے کی اب بھی ضرورت ہے تاکہ وہ اس صنف کو اسکے صحیح مقام تک پہنچا سکیں جس سے بہار میں اردو ڈراما نگاری کی ترقی دیگر اصناف ادب کے ساتھ بھرپور طور پر ہوسکے۔

اُردو ڈرامانگاری کے ارتقا میں بہار کا حصّہ

یوں تو پندرھویں صدی میں بہار میں سنسکرت اور میتھلی میں ایسے ڈرامے لکھے گئے ہیں جو دنیا کے بہترین ڈراموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن بہار کے اردو ڈرامانگار ان ڈراموں سے مستفید نہ ہو سکے۔ بہار کے اردو ڈرامانگاروں نے اس فن پر بہت دیر سے طبع آزمائی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہار میں اردو ڈرامانگاری خاطر خواہ ترقی نہ کر سکی۔

بہار کے ڈراموں اور ڈرامانگاروں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اردو ڈرامانگاری کے ارتقائی دور میں ہی یہاں کئی بہت ہی کامیاب اور موثر ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ ڈرامے بہت زمانے تک گمنامی کے عالم میں پڑے رہے۔ راقم الحروف نے ڈرامہ "سجاد سنبل" کو اردو رسم الخط میں "مطالعہ سجاد سنبل" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ یہ بہار کا پہلا اردو ڈرامہ ہے۔ جو اصل میں دیوناگری رسم الخط میں تحریر شدہ تھا۔ اس ڈرامے کو مصنف منشی کیشورام بھٹ نے ۱۸۷۴ء میں تخلیق کیا۔ اسکے کئی ایڈیشن دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوئے۔ لیکن ہندی والے اس سے خاطر خواہ مستفید نہ ہو سکے۔ مجھے امید ہے "مطالعہ سجاد سنبل"

کی اشاعت سے اسکی اہمیت وافادیت واضح ہوگی ۔ یہ اردو ڈراموں میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسکے بعد ۱۸۷۷ء میں منشی کیشورام بھٹ نے دوسرا ڈراما "شمشاد سوسن" لکھا جسے اسٹیج پر کئی بار پیش کیا جا چکا ہے لیکن یہ کتاب اب تک دیوناگری رسم الخط میں ہے ۔ جس سے ہندوستان کے باذوق ہندی مصنف بھی پوری طرح مستفید نہ ہو سکے ۔ مصنف نے اس ڈرامے کو دیوناگری رسم الخط میں پیش کرتے ہوئے۔ دیوناگری رسم الخط کو ہندوستان کی دیگر زبانوں کے رسم الخط سے آسان اور عمدہ بتایا ہے ۔ لیکن ساتھ ہی سجاد سنبل کی غیر مقبولیت اور ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب "مراۃ العروس" کی مقبولیت کا راز اردو رسم الخط ہی کو بتایا ہے اور مسلمانوں پر الزام عائد کیا ہے کہ مسلمان دیوناگری رسم الخط سے تعصب برتتے ہیں جو بے جا ہے۔ موجودہ دونوں ڈرامے یعنی "سجاد سنبل" اور "شمشاد سوسن" کو ہندی تنقید نگاروں نے ہندی ادب میں نایاب کہہ کر گمنامی کے عالم میں ڈال رکھا ہے ۔ اردو زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کی بدولت ان دونوں ڈراموں کی قدر و قیمت دنیائے ادب میں برقرار ہے اور لوگ اسکی ادبی اور فنی اہمیت سے مستفید بھی ہو رہے ہیں ۔ لہذا مصنف کے دونوں ڈرامے اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ان کا ایک اور

ڈراما "اندھوں کو آنکھ" کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس لحاظ سے منشی کیشو رام بھٹ کو بہار کا پہلا اردو ڈراما نگار قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۸۷۶ء کے بعد بہار میں چوتھا ڈراما مولوی سید محمد نواب نے "جوان بخت و شمس النہار" لکھا جو ادبی اہمیت کا حامل ہے یہ بہار کا پہلا منظوم ڈراما ہے۔

ڈراما "ناٹک محسن" خواجہ محسن علی مونگیری نے لکھا۔ یہ بھی منظوم ڈراما ہے۔ یہ ڈراما قدیم ہندوستانی کہانی پر مبنی ایک اصلاحی ڈراما ہے۔ ۱۸۹۶ء میں منشی زوار حسین کا ڈراما "کھیل طلسمات تقدیر عرف بہرام گور" بہار کے ڈراموں میں اہم مقام رکھتا ہے کیونکہ اس ڈرامے میں پہلی دفعہ بیک وقت دو پلاٹ استعمال کیے گئے ہیں اس طرح کے پلاٹ بعد میں صرف آغا حشر کاشمیری کے چند ڈراموں میں ملتے ہیں۔ اور اسی سال ڈراما "گلشن ہیبت شگوفہ حسرت" نامی کتاب لکھی گئی جو مصنف ہری ہر پرشاد عرف لال بابو دیہاتی کی تخلیق ہے۔ یہ اپنے آپ میں نصیحت آموز لیکن ظریفانہ اور مزاحیہ کامیاب ڈراما ہے۔ شمس گیاوی نے "ترکی خوان"، "کلجگ"، "سلطانہ ڈاکو"، "آنکھ کی خطا"، "کایا پلٹ عرف شمس و قمر اور ڈاکو کی دلہن" نامی ڈرامے لکھے ہیں۔

ڈاکٹر اختر اورینوی نے اردو ڈراما کو ایک نئی سمت دینے کی کامیاب کوشش کی اور بہار میں پہلی دفعہ انھوں نے جنگ کے

ہولناک ماحول کو اپنے ڈراما میں پیش کر کے اس میں ہونے والی بربادی کو بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ ان کے ڈرامے "شہنشاہ جلبشہ" اور زوال کینٹین، بہار کے ڈراموں میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔

ضیار عظیم آبادی بہار کے ڈراما نگاروں میں منفرد ہیں جنہوں نے ہونل دمنتی، بے وطن کی عید، پریم شکتی، ہمایوں، شیریں فرہاد، ہٹلر، آواز،..... پہلی ٹھوکر، اور گاؤں کی شام، لکھے جو قابل ذکر ہیں۔

عزم بازید پوری نے دیش کی پکار، آنسو، کسان کی بیٹی، انوکھی سہاگن، ہمایوں، اور نشانہ، کامیاب ڈرامے لکھے ہیں۔

ڈاکٹر طارق جمیلی نے بہار کی ڈراما نگاری کو ایک نئی راہ سے آگاہ کیا۔ ان کا پہلا ڈراما "آگ اور پانی" بہار کا پہلا تمثیلی اردو ڈراما ہے جس میں جنگ و جدل کی ہولناکی کا بڑا ہی ہیبت ناک نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اسکے علاوہ انھوں نے غالب کی زندگی اور اسکی محبت پر مبنی اردو کا سب سے زیادہ حسین اور دلچسپ ڈراما "شکست کی آواز" لکھا جو آج بھی غالب اور ترک بیگم کی محبت پر تحقیق دعوت دیتا ہے۔ ان کا ایک اور ڈراما "انسان" ہے جو اسٹیج بھی ہو چکا ہے۔ مصنف سے آئندہ بھی اچھے ڈرامے کی تخلیق کی توقع ہے ان کے ڈرامے کی خاصیت یہ ہے کہ تمام

ڈرامے اسٹیج کیلئے لکھے گئے ہیں اور کامیابی کے ساتھ پیش بھی
کئے جا چکے ہیں۔

"استاد شیرو"، بدر عظیم آبادی کا ایک مزاحیہ ڈراما ہے جو اصلاحی
بھی ہے۔ یہ بہار کے ڈراموں کی تاریخ میں ایک اضافہ ہے

ڈاکٹر سمیع الحق نے تخلیق کے ساتھ ساتھ دو قدیم یونانی
ڈرامے "انطی گونی" اور شہنشاہ ایڈیپس کا منظوم ترجمہ کیا
یہ دونوں ڈرامے دنیا کے بہترین ڈراموں میں شمار کئے جاتے ہیں
یہ شاعر اعظم سوفوکل کے شاہکار ہیں۔ سمیع الحق نے ان ڈراموں
کو اردو ادب سے روشناس کرا کے قابل قدر خدمت انجام دی
ہے اس کے علاوہ ان کا ڈراما "خسرو و شیریں" بھی ادبی اہمیت
کا حامل ہے۔ دراصل امیر خسرو کی مشہور فارسی مثنوی "خسرو شیریں"
کو مصنف نے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں ڈرامے کے قالب میں
ڈھالا ہے۔ جو بہار میں ہی نہیں بلکہ اردو ڈرامے کی تاریخ میں قابل
قدر اضافہ ہے ان کا طبع زاد ڈراما "بھیگی بستی" موجودہ سماج کی
برائی پر بھر پور چوٹ ہے۔ اور مختصر ڈراموں میں اسکی اہمیت
منفرد ہے۔

سید ظہیر احسن نے ہارڈی کے ناول The Mayor of The Casterbridge کے قصے کو ڈرامے کے قالب میں
"ساگر اور لہریں" کے نام سے ڈھالا ہے جو ادبی اہمیت کا حامل ہے۔

شفیع مشہدی نے کئی جدید ریڈیائی ڈرامے لکھے ہیں ان میں "اجنبی دیواریں، دوسرا کینسر، دوپہر کے بعد، انگلیاں فگار اپنی، پتھر کا شہر" اور "مٹھی بھر خاک قابلِ ذکر ہیں۔ یہ بہار کے ڈراموں میں اضافہ ہیں۔

شین مظفر پوری نے جہاں اپنے افسانے کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا ہے وہیں کئی مختصر ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے ہیں ان ڈراموں میں "سو کا نوٹ، انٹرویو کا چکر، سرکس کا شیر، تیسری آنکھ، انوکھی بات، بے چارہ شاعر" اور "خون کی مہندی" موثر اور توجہ کے مستحق ہیں۔ انھوں نے اپنے تمام ڈراموں میں موجودہ سماج کی برائی کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے زیادہ تر ڈرامے اصلاحی ہیں۔

شہیل عظیم آبادی کے ڈرامے "راہ کا دیا" "شیر شاہ، نینا جوگن، غلط فہمی، روشش، عید کی ایک شام" "ایک ولی پوشیدہ اور کافر کھلا" اور "جہاں آرا، ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ اسکے علاوہ انھوں نے ایک ریڈیائی فیچر بعنوان "دبستان عظیم آباد" بھی تحریر کیا ہے۔ جو قابل قدر ہے۔

تمنا مظفر پوری نے اپنے مزاحیہ اور ظریفانہ انداز میں کامیاب ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کے ڈرامے "قصہ کراسن تیل کا، مجھے پھانسی دیدیں، جہیز کی ریل گاڑی، "رستم وسہراب" اور "مچھلیوں کی عدالت

کامیاب اصلاحی ریڈیائی ڈرامے ہیں

اس کے علاوہ پروفیسر مظفر اقبال کا ڈراما "پریم یا بیوپار" تلک اور جہیز کے خلاف ایک موثر ڈراما ہے۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی کا ڈراما "سب خیریت ہے" ریڈیو سے نشر ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے۔

سلطان آزاد کے بھی مزاحیہ و طنزیہ ڈرامے "قصہ ایک شاعر کا" "نکتہ چیں" ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں جو کافی دلچسپ ہیں۔

عظیم اقبال نے دو مختصر ڈرامے "نیا عہد نامہ" اور "کوئی وعدہ نہیں" تحریر کئے ہیں۔ جو کافی مقبول ہوئے۔ "نیا عہد نامہ" فرقہ پرستی پر مبنی موثر اور اصلاحی ڈراما ہے۔

مظہر جمیل کا ڈراما "بلا ٹلی" کئی بار ریڈیو سے نشر ہو چکا ہے جو ایک مزاحیہ اور دلچسپ ڈراما ہے۔

شکیل الرحمن اور شمیم فاروقی نے بھی ریڈیائی ڈرامے لکھے ہیں ذکی انور کا ڈراما "آگ اور پھول" ادبی اہمیت کا حامل ہے

پروفیسر قمر التوحید نے انگریزی ادب کے مختصر ڈرامے اور افسانے کے طرز پر مبنی ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کے ڈرامے "گوداوری کی گود میں" "ممی کا پنجہ" "عید کا دن" ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ جو ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔

نوید ہاشمی کے ڈرامے "کلاکار" اور "میٹھا زہر" بہت ہی کامیاب

ہیں۔ ڈاکٹر محمد قاسم کے ڈرامے "ارادہ"، فیصلہ"، انصاف"، انٹرویو اور قصہ ٹیلی ویژن کا، بہار کے مختصر ڈرامے میں اضافہ ہیں۔ انجم مانپوری کا افسانہ "ممبر کلو کی گواہی" افسانہ ہوتے ہوئے بھی ڈرامے کی خاصیت رکھتا ہے اور یہ کئی دفعہ مختلف کالجوں اور اسکولوں میں اسٹیج ہوا ہے۔

شمیم عالم مصحفی کا لکھا ڈرامہ "نو لکھا ہار"، اور کرشمہ محنت کا، قابل توجہ ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے ڈرامے "نعم البدل"، دائرہ، معصوم گناہ، اسمبلی، عقل کے دشمن، ٹھنڈا اندھیرا، اور انسان ساز مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں جو بہار کے مختصر ڈراموں میں اہم اضافہ ہیں۔

اسکے علاوہ بہار کی پہلی ڈراما نگار خاتون ڈاکٹر شمیم افزا قمر نے چار ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کے ڈراموں "اُجالا باقی ہے، کتنے روپ، ٹرنکو لائزر کی گولیاں، اور دیوان غالب، کو اُردو ڈراموں میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان سے مستقبل میں اچھے ڈرامے تخلیق کیے جانے کی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

اس لمبی فہرست کے باوجود آج بھی ضرورت ہے کہ بہار کے ادیب اور فنکار اسکی طرف توجہ دیں۔ تاکہ بہار میں اردو ڈرامانگاری کی تاریخ دیگر اصناف ادب کی طرح جامع اور وسیع ہو سکے۔

※ ※ ※

کتابیات

۱ مقدمات عبدالحق — مولوی عبدالحق

۲ جدید و قدیم — میتھو آرنلڈ

۳ اردو تنقید پر ایک نظر — کلیم الدین احمد

۴ ناٹک ساگر — محمد نور الٰہی

۵ اردو تھیٹر — ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

۶ اردو ڈراما اور شاہی اسٹیج — مسعود حسن رضوی ادیب

۷ اردو ڈراما روایت اور تجربہ — ڈاکٹر عطیہ نشاط ....

۸ اردو ڈرامے کا ارتقار — عشرت رحمانی

۹ آغا حشر اور اردو ڈراما — انجمن آرا

۱۰ اردو کے اہم ڈراما نگار — ابراہیم یوسف

۱۱ اردو ڈراما تاریخ و تنقید — عشرت رحمانی

۱۲ اردو ڈراما نگاری کا فن — سید بادشاہ حسین

۱۳ اردو ڈراما — عبدالسلام خورشید

۱۴ فن ڈراما — ایس انجم الحسن انجم ادیب

۱۵ شاعری اور ڈراما — مترجم جمیل جالبی

۱۶ ادبی ڈرامے — ڈاکٹر اعجاز حسین

۱۷ سخن ہائے گفتی — کلیم الدین احمد

۱۸ بوطیقا — ارسطو / مترجم عزیز احمد

۱۹ اردو ڈراما — ڈاکٹر قمر رئیس

۲۰ تاریخی ڈرامے — آفاق احمد

۲۱ اردو ڈراما نگاری — سید بادشاہ خان حیدری

۲۲ تاریخ ادب۔ اردو — رام بابو سکسینہ

۲۳ اردو کا پہلا ڈراما — اخلاق اثر

۲۴ آغا حشر اور ان کے ڈرامے — سید وقار عظیم ....

۲۵ ڈراما آغا حشر کے بعد — سید وقار عظیم

۲۶ مطالعہ تنقید — اختر انصاری

۲۷ اردو ڈراما نگاری — قمر اعظم ہاشمی

۲۸ ڈراما نگاری کا فن — اسلم قریشی

۲۹ بہار میں اردو اسٹیج اور اردو ڈراما — سید حسین ....

۳۰ بہار میں اردو نثر کا ارتقار — ڈاکٹر سید مظفر اقبال

۳۱ منتخب افسانے — مرتبہ۔ پروفیسر عبدالاحد

۳۲ ہندی ناٹک کوش (ہندی) — دشرتھ اوجھا

۳۳ بہار کا ساہتیہ پہلا بھاگ (ہندی) — مرتبہ بابو شیو نندن سہائے۔

۳۴ بہار کا پرادیشک ہندی سمیلن (ہندی) — بابو شیو نندن سہائے

۳۵ ہندی ناٹک پنر ملیانکن (ہندی) — ڈاکٹر ستوجہ ....

۳۶ بھارتیہ رنگ منچ کا دیویچناتمک اتہاس (ہندی) — ڈاکٹر اگیات ....

۳۷ پانچ صحیفے — بہار ٹیکسٹ بک کارپوریشن پٹنہ

رسائل

۱ بھاشا ساہتیہ سنسکرتی پردھان۔ سہ ماہی۔ (ہندی رسالہ)
۲ دھرتیگ ۔ رسالہ ۱۹۸۱ء۔ ۲۶۔ اپریل
۳ نیا دور ۔ لکھنؤ
۴ مریخ ۔ پٹنہ
۵ ماہنامہ صنم ۔ پٹنہ
۶ آہنگ جنوری ۱۹۸۰ء
۷ توازن مالیگاؤں ۔ شمارہ ۸۷
۸ شگوفہ حیدر آباد ۔ ۱۹۸۱ء
۹ آجکل دھلی ۔
۱۰ تعمیر ہریانہ ۔
۱۱ پرواز ادب ۔ امرتسر
۱۲ آواز ۔ آل انڈیا ریڈیو دھلی
۱۳ زبان وادب ۔ پٹنہ
۱۴ شاعر ۔ بمبئی
۱۵ ماہِ نو کراچی ۔ پاکستان
۱۶ توازن ۔
۱۷ امکان ۔ بمبئی
۱۸ ماہنامہ "قند" ڈرامانمبر
۱۹ ادب لطیف ۔ پاکستان
۲۰ نورس ۔ جولائی اگست ستمبر ۱۹۷۹ء بمبئی
۲۱ شب خون ۔
۲۲ کتاب نما ۔ دہلی
۲۳ صدائے عام روزانہ پٹنہ

نام	محمد قاسم
پیدائش	۱۹۴۷ء - ۳ - ۲۹
مقام	بھیکن پور میٹک لین، بھاگلپور
نام والد	محمد مقبول حسین
نام والدہ	بی بی جمیلہ خاتون
ازدواج	شمیمہ خاتون
تعلیم	ابتدائی تعلیم مدرسہ بھیکن پور
میٹرک	شیام سندر اسکول بھاگلپور
بی۔اے	اردو آنرس ٹی۔این۔بی کالج
ایم۔اے	اردو مگدھ یونیورسٹی
ملازمت	صدر شعبۂ اردو۔ بی۔این کالج بھاگلپور بہار
موجودہ سکونت و پتہ	مولوی حسین بخش لین محلہ میر غیاث چک پوسٹ چمپانگر بھاگلپور۔ بہار۔

تصانیف

۱ مطالعہ سجاد سنبل (بازیافت، مکمل کتاب)۔۔۔۔۔۔۔

۲ دستک (رسالہ)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۳ شمشاد سوسن (بازیافت مکمل ڈراما، زیر طبع)۔۔۔۔

۴ مقالات (مجموعہ مضامین، زیر طبع)۔۔۔۔۔۔۔

۵ قصہ ٹیلی ویژن کا (ڈرامے کا مجموعہ، زیر طبع)۔۔۔۔

URDU DARAMA NIGARI-KE-IRTEQAME, BIHAR KA HISSA

Dr. Md. Qasim

"اردو ڈرامانگاری کے ارتقاء میں بہار کا حصہ"

عزیزی ڈاکٹر محمد قاسم، ریڈر و صدر، شعبۂ اردو، بھاگلپور نیشنل کالج، بھاگلپور، کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جو راقم الحروف کی نگرانی میں لکھا گیا ہے اور جس پر تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسٹی بھاگلپور نے انہیں سنہ ۱۹۹۰ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی ہے۔

یہ مقالہ محنت اور لگن سے لکھا گیا ہے، چنانچہ میرے مشورے سے عزیزِ موصوف نے اب تقریباً سات سال کے بعد اس کی طباعت و اشاعت کا سامان کیا ہے۔ مجھے پوری توقع ہے کہ یہ شائع ہو کر اہلِ نظر کے درمیان مقبول ہوگا، اس لئے کہ یہ اپنے موضوع پر ایک مکمل مقالہ ہے۔

عزیزی ڈاکٹر محمد قاسم سلمہٗ میرے ان چند تلامذہ میں سے ایک ہیں جنہوں نے محض اپنی محنت اور ذہانت سے اہلِ علم کے درمیان اپنے لئے ایک ممتاز مقام پیدا کیا ہے۔ ان کے ڈرامے، افسانے اور مضامین اکثر اخبار و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مقالہ ان کی پہلی مستقل تصنیف ہے جس کا تعلق تحقیق و تنقید سے ہے۔ اس میں انھوں نے ریاستِ بہار میں لکھے جانے والے اردو ڈراموں پر تفصیل سے تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اور ان کی قدر و قیمت بھی متعین کی ہے۔ اسکی اشاعت سے اردو میں ڈرامانگاری کی تاریخ مرتب کرنے والوں کو اس موضوع سے متعلق کچھ ایسا مواد ملے گا جو اب تک منظرِ عام پر نہیں آسکا ہے، چنانچہ آئندہ جب بھی اردو میں ڈرامانگاری کی مبسوط تاریخ لکھی جائیگی تو اس مقالہ سے استفادہ کرنا ناگزیر ہوگا۔ فی الوقت میں اس سے زیادہ کچھ اور عرض کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ ع

"مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید"

مظفر اقبال

۲۳-اپریل سنہ ۹۷ء

سابق صدر شعبۂ اردو تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسٹی بھاگلپور بہار۔